نصابِ اردو

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان نمبر ۴۳۳

نصاب اردو

حصہ نثر

(کراچی یونی ورسٹی کے منظور کردہ نصاب کے مطابق)

برائے

جماعت ہائے انٹرمیڈیٹ (فنون)، و انٹر کامرس

مرتبہ

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی نمبر ۱

سنہ اشاعت اوّل ——— ۱۹۵۶ء

سنہ اشاعت دوم ——— ۱۹۸۱ء

دوسرا ایڈیشن ———

تعداد : ——— ۵۰۰

ناشر : ——— انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ کراچی

طابع : ——— انجمن پریس کراچی نشتر روڈ کراچی

کتابت : ——— آنسہ رشیدہ بیگم

قیمت : ——— ۱۵ پندرہ روپے

فہرست مضامین

نصاب اردو

نمبر	مضمون		صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	پہلے درویش کی سرگذشت	(باغ و بہار)	میرامن دہلوی	۱
۲	جان عالم کا توتا خریدنا	(فسانۂ عجائب)	رجب علی بیگ سرور	۲۱
۳	امید کی خوشی	(تہذیب الاخلاق)	سرسید احمد خاں	۳۲
۴	رقعات غالب	(اردوئے معلیٰ)	مرزا اسداللہ خاں غالب	۳۸
۵	مرزا ظاہردار بیگ	(توبۃ النصوح)	مولوی نذیر احمد	۴۴
۶	شعر کی ماہیت	(مقدمۂ شعر و شاعری)	مولوی الطاف حسین حالی	۵۵
۷	شہرت عام و بقائے دوام کا دربار	(نیرنگ خیال)	مولوی محمد حسین آزاد	۵۹
۸	ظہور قدسی	(سیرۃ النبی)	مولوی شبلی نعمانی	۷۷
۹	اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ	(افادات مہدی)	مہدی الافادی	۸۹
۱۰	مرزا غالب کے اخلاق و عادات	(یادگار غالب)	مولوی الطاف حسین حالی	۹۸

۱۱۔ میٹا برج کے حالات	(مضامین شرر)	عبدالحلیم شرر	۱۲۲
۱۲۔ الداء والدواء	(مضامین آزاد)	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۴۷
۱۳۔ گدڑی کا لال	(چند ہم عصر)	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۱۵۲
۱۴۔ نام دیو	(؍؍)	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۱۶۱
۱۵۔ اردو کی تاریخ	(خطبات عبدالحق)	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۱۶۶

باغ و بہار

(میر امن دہلوی)

پہلے درویش کی سرگزشت

پہلا درویش دو زانو ہو بیٹھا اور اپنی سیر کا قصّہ اس طرح سے کہنے لگا۔

یا معبود اللہ ذرا ادھر متوجہ ہو اور ماجرا اس بے سر و پا کا سنو :۔

یہ سرگزشت میری ذرا کان دھر سنو — مجھ کو فلک نے کر دیا زیر و زبر سنو
جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدت مرے تئیں — اس کا بیان کرتا ہوں، تم سر بسر سنو

اے یاراں!

میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز کا ملک التجار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بیوپاری اُن کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کی گھر میں موجود تھی۔ اُن کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہی فقیر جو کفنی سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کی حضوری میں حاضر اور بولتا ہے، دوسری ایک بہن جس کو قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی شہر کے ایک سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی۔ وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی۔ غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو اُس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانہ ہے؟ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوز سے ماں باپ کے سائے میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب و فن، سوداگری کا بہی کھاتہ، روزنامہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گزرے، کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گئے۔

عجب طرح کا غم ہوا جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ ایک بارگی یتیم ہو گیا۔ کوئی سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات دن رویا کرتا، کھانا پینا سب چھوٹ گیا چالیس دن جوں توں کر کٹے، چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ

سے فراغت ہوئی سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا "دنیا میں سب کے ماں باپ، مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ بس صبر کرو۔ اپنے گھر کو دیکھو۔ اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے۔ اپنے کاروبار لین دین سے ہوشیار رہو تسلی دے کر وے رخصت ہوئے۔ گماشتے کاروبار نوکر چاکر جتنے تھے آن کر حاضر ہوئے، نذریں دیں اور بولے۔ کوٹھی نقد و جنس اپنی نظر مبارک سے دیکھ لیجئے۔ ایک بارگی جو اس دولت بے انتہا پر نگاہ پڑی آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کا حکم کیا فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت پردے چلونیں تکلف کی لگادیں اور اچھے اچھے خدمت گار دیدار دلوکر رکھے۔ سرکار سے زرق برق پوشاکیں بنوادیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھا ویسے ہی آدمی غنڈے بھانکڑے مفت پر کھانے پینے والے جھوٹے خوشامدی آکر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے اُن سے آٹھ پہر صحبت رہنے لگی۔ ہر کہیں کی باتیں اور زٹلیں واہی تباہی اِدھر اُدھر کی کرتے اور کہتے۔ اس جوانی کے عالم میں کیتکی کی شراب یا گل گلاب کھچوائیے نازنین معشوقوں کو بلوا کر اُن کے ساتھ پیجئے اور عیش کیجیے۔

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا شراب ناچ اور جوئے کا چرچا شروع ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی جو جس کے ہاتھ پڑا الگ کیا۔ گویا لوٹ مچادی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے، کہاں سے آتا ہے اور کیدھر جاتا ہے؟ مال مفت دل بے رحم۔ اس درخرچی کے آگے اگر گنج قارون کا ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصہ میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نثار کرتے تھے کافور ہو گئے۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے اور نوکر چاکر، خدمت گار، بہلیے، ڈھلیت خاص برادر، ثابت خانی، سب چھوڑ کر کنارے لگے۔ کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے یہ کیا تمہارا حال ہوا؟ سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔

اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے گڑا کے کھینچے تاب بھوک کی نہ لا سکا۔ لاچار بے حیائی کا برقعہ منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے پاس چلیے۔ لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا نہ خالی خط لکھا۔ بلکہ اُس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے اُن کا بھی جواب اس خواب خرگوش میں نہ بھیجا۔ اس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا، پر سوائے اس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جوں توں پیادہ خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر ہمشیرہ کے شہر میں جا کر اس کے مکان پر پہنچا۔ اُس ماجائی نے میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لیں اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل ماش اور کالے ٹکے مجھ پر سے صدقے کیے۔ کہنے لگی "اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا لیکن بھیّا، تیری یہ کیا صورت بنی؟" اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وہ کپڑے پہنے، ایک مکان اپنے پاس بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات، حلوا سوہن، پستہ مغزی ناشتے کو اور تیسرے پہر میوے خشک و تر پھل پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاؤ، نان، قیمہ، کباب، تحفہ تحفہ مزیدار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطر داری کرتی میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا خدا کی بارگاہ میں ہزار ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گزرے کہ پاؤں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی۔ کہنے لگی "اے بیرن! تو میرے آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا۔ لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے اپنے باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمھاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے

کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی اور مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو"۔

یہ بات سن کر مجھے بھی غیرت آئی۔ اُس کی نصیحت پسند کی جواب دیا "اچھا تم ماں کی جگہ ہو، جو کہو سو کروں"۔ یہ میری مرضی پا کر گھر میں جا کے پچاس توڑے اشرفی کے اصیل لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی "ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے تم ان روپیوں سے جنس تجارت خرید کرو، ایک تاجر ایماندار کے حوالے کر کے، دستاویز پکی لکھوا لو اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو اپنا مال منافع سمجھ بوجھ کر بیچو یا بیچوا" میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا، اسباب سوداگری خرید کر ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت وخواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی تیاری کی۔ جب رخصت ہونے لگا بہن نے ایک سرے پاؤ بھاری اور گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان ایک خاصدان بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا۔ دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا آنسو پی کر بولی "سدھارو! تمھیں خدا کو سونپا، پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو" میں نے فاتحۂ خیر پڑھ کر کہا "تمہارا بھی اللہ حافظ ہے۔ میں نے قبول کیا"۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکل پر بھروسا کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس پہنچا۔

غرض جب شہر کے دروازے پر گیا، بہت رات جا چکی تھی۔ دربان اور نگاہ بانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت منت کی کہ مسافر ہوں دور سے دھاوا مارے آتا ہوں اگر کواڑ کھول دو شہر جا کر میں دانے گھاس کا آرام پاؤں۔ اندر سے گھڑک کر بولے "اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں۔ کیوں اتنی رات گئے تم آئے؟" جب میں نے جواب صاف اُن سے سنا، شہر پناہ کی دیوار کے تلے گھوڑے پر سے اتر زین پوش بچھا کر

بیٹھا۔ جاگنے کی خاطر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جس وقت آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر ہوئی سنسان ہوگیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں اچنبھے میں ہوا کہ یہ کیا طلسم ہے؟ شاید خدا نے میری حیرانی و سرگردانی پر رحم کھا کر خزانہ غیب سے عنایت کیا۔ جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا۔ دیکھا تو کاٹھ کا صندوق ہے۔ لالچ سے اُسے کھولا۔ ایک معشوق خوبصورت کامنی سی عورت (جس کے دیکھنے سے ہوش جاتے رہے) گھائل لہو میں تربتر آنکھیں بند کیے کلبلاتی ہے آہستہ آہستہ ہونٹ ہلتے ہیں اور یہ آواز منہ سے نکلتی ہے۔ "اے کم بخت بے وفا! اے ظالم پر جفا!! بدلا اس بھلائی اور محبت کا یہی تھا جو تو نے کیا؟ بھلا ایک زخم کاری اور بھی لگا۔ میں نے اپنا تیرا انصاف خدا کو سونپا" یہ کہہ کر اسی بے ہوشی کے عالم میں ڈوپٹے کا آنچل منہ پر لے لیا۔ میری طرف دھیان نہ کیا۔

فقیر اس کو دیکھ کر اور یہ بات سن کر سُن ہوا۔ جی میں آیا کسی بے حیا ظالم نے کیوں ایسے نازنین صنم کو زخمی کیا؟ کیا اُس کے دل میں آیا؟ اور ہاتھ اس پر کیوں کر چلایا؟ اس کے دل میں تو محبت اب تلک باقی ہے جو اس جان کندنی کی حالت میں اُس کو یاد کرتی ہے میں آپ ہی یہ کہہ رہا تھا۔ آواز اُس کے کان میں گئی۔ ایک مرتبہ کپڑا منہ سے سرکا کر مجھ کو دیکھا۔ جس وقت اُس کی نگاہیں میری نظروں سے لگیں مجھے غش آنے اور جی سنسنانے لگا۔ بہ زور اپنے تئیں تھاما جرأت کر کے پوچھا "سچ کہو کہ تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے؟ اگر بیان کرو میرے دل کو تسلی ہو" یہ سن کر اگرچہ بولنے کی طاقت نہ تھی آہستے سے کہا "شکر ہے۔ میری حالت زخموں کے مارے یہ کچھ ہو رہی ہے کیا خاک بولوں؟ کوئی دم کی مہمان ہوں جب میری جان نکل جائے تو خدا کے واسطے جواں مردی کر کے مجھ بدبخت کو اسی صندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجیو تو میں بھلے بُرے کی زبان سے نجات پاؤں اور تو داخل ثواب کے ہو"

اتنا بول کر چپ ہوئی۔ رات کو مجھ سے کچھ تدبیر نہ ہو سکی۔ وہ صندوق اپنے پاس اٹھا لایا اور گھڑیاں گننے لگا کہ کب اتنی رات تمام ہو تو فجر کو شہر میں جا کر جو کچھ علاج اس

کا ہو سکے بہ مقدور اپنے کروں۔ وہ تھوڑی سی رات ایسی پہاڑ ہوگئی کہ دل گھبرا گیا۔

بارے خدا خدا کر کے صبح جب نزدیک ہوئی، مرغ بولا، آدمیوں کی آواز آنے لگی۔ میں نے فجر کی نماز پڑھ کر صندوق کو خورجی میں کسا۔ جونہیں دروازہ شہر کا کھلا، میں شہر میں داخل ہوا۔ ہر ایک آدمی اور دکان دار سے حویلی کرائے کی تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ایک مکان خوش قطع نیا فراغت کا بھاڑے لے کر جا اترا۔ اُس معشوق کو صندوق سے نکال کر روئی کے پھلوں پہ ملائم بچھونا کر کے ایک گوشے میں لٹایا اور آدمی اعتباری وہاں چھوڑ کر فقیر جراح کی تلاش میں نکلا۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ اس شہر میں جراح کاریگر کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ ایک شخص نے کہا، ایک حجام جراحی کے کسب اور حکیمی کے فن میں یکا ہے اور اس کام میں نپٹ پکّا ہے، اگر مردے کو اُس کے پاس لے جاؤ، خدا کے حکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وہ بھی جی اُٹھے، وہ اس محلے میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے۔

میں یہ مژدہ سُن کر بے اختیار چلا۔ تلاش کرتے کرتے پتے سے اُس کے دروازے پہ پہنچا۔ ایک مرد سفید ریش کو دہلیز پہ بیٹھا دیکھا اور کئی آدمی مرہم کی تیاری کے لیے کچھ پیس پاس رہے تھے۔ فقیر نے مارے خوشامد کے ادب سے سلام کیا اور کہا "میں تمھارا نام اور خوبیاں سُن کر آیا ہوں۔ ماجرا یہ ہے کہ میں اپنے ملک سے تجارت کے لیے چلا۔ قبیلے کو بہ سبب محبت ساتھ لیا۔ جب نزدیک اس شہر کے آیا، تھوڑی سی دور رہا تھا کہ شام پڑگئی۔ ان دیکھے ملک میں رات کو چلنا مناسب نہ جانا، میدان میں ایک درخت کے تلے اُتر پڑا۔ پچھلے پہر ڈاکا آیا، جو کچھ مال اسباب پایا لوٹ لیا۔ گہنے کے لالچ سے اس بی بی کو بھی گھائل کیا۔ مجھ سے کچھ نہ ہو سکا۔ رات باقی تھی جوں توں کر کے کاٹی، فجر ہی شہر میں آن کر ایک مکان کرائے لیا۔ ان کو وہاں رکھ کر میں تمھارے پاس دوڑا آیا ہوں۔ خدا نے تمھیں یہ کمال دیا ہے، اس مسافر پہ مہربانی کرو، غریب خانے تشریف لے چلو، اُس کو دیکھو۔ اگر اُس کی زندگی ہوئی تو تمھیں بڑا جس ہوگا اور میں ساری عمر غلامی کروں گا۔

عیسیٰ جراح بہت رحم دل اور خدا پرست تھا، میری غریبی کی باتوں پہ ترس کھا کر

میرے ساتھ اُس حویلی تک آیا۔ زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلّی کی، بولا کہ خدا کے کرم سے اس بی بی کے زخم چالیس دن میں بھر آویں گے غسل شفا کا کروا دوں گا۔

غرض اُس مرد خدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے دھو دھا کر صاف کیا۔ جو لایق ٹانکوں کے پائے انھیں سیا۔ باقی گھاؤں پر اپنے کیسے سے ایک ڈبیا نکال کر کتنوں میں پٹی رکھی اور کتنوں پر پھائے چڑھا کر پٹی سے باندھ دیا اور نہایت شفقت سے کہا: "میں دونوں وقت آیا کروں گا، تو خبردار رہیو ایسی حرکت نہ کرے جو ٹانکے ٹوٹ جائیں۔ مرغ کا شوربا بجائے غذا اُس کے حلق میں چوائیو اور اکثر عرق بید مشک گلاب کے ساتھ دیا کیجیو جو قوت رہے"۔

یہ کہہ کر رخصت چاہی۔ میں نے بہت منّت کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا: "تمھاری تشفی دینے سے میری بھی زندگی ہوئی نہیں تو سوائے مرنے کے کچھ سوجھتا نہ تھا، خدا تمھیں سلامت رکھے۔"

عطر پان دے کر رخصت کیا۔ میں رات دن خدمت میں اُس پری کے حاضر رہتا آرام اپنے اوپر حرام کیا۔ خدا کی درگاہ سے روز روز اُس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا۔

اتفاقاً وہ سوداگر بھی آپہنچا اور میرا مال امانت میرے حوالے کیا۔ میں نے اُسے اونے پونے بیچ ڈالا اور دارو درمن میں خرچ کرنے لگا۔ وہ مرد جراح ہمیشہ آتا جاتا تھوڑے عرصے میں سب زخم بھر کر انگور کر لائے بعد کئی دن کے غسل شفا کا کیا۔ عجب طرح کی خوشی حاصل ہوئی۔ خلعت اور اشرفیاں عیسیٰ حجام کے آگے دھریں اور اُس پری کو مکلف فرش بچھا کر مسند پر بٹھایا۔ فقیر نے غریبوں کو بہت سی خیر خیرات کی۔ اُس دن گویا بادشاہت ہفت اقلیم کی اس فقیر کے ہاتھ لگی۔ اور پری کا شفا پانے سے ایسا رنگ نکھرا کہ مکھڑا سورج کے مانند چمکنے اور کندن کی طرح دمکنے لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی جو اس جمال پر ٹھہرے۔ فقیر بسر و چشم اُس کے حکم میں حاضر رہتا۔ جو فرماتی سو بجا لاتا۔ وہ اپنے حسن کے غرور اور سرداری کے دماغ میں جو میری طرف کبھو دیکھتی تو فرماتی:

"خبردار! اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دم نہ ماریو۔ جو

ہم کہیں سو بلا عذر کیے جائیو۔ اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو۔ نہیں تو پچھتاوے گا۔"

اُس کی وضع سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حق میری خدمت گزاری کا اور فرماں برداری کا اُسے البتہ منظور ہے۔ فقیر بھی اُس کی بے مرضی یک کام نہ کرتا اور اُس کا فرمانا بسر و چشم بجا لاتا۔

ایک مدت اسی راز و نیاز میں کٹی۔ جو اُس نے فرمائش کی وونہیں میں نے لاکر حاضر کی۔ اس فقیر کے پاس جو کچھ جنس اور نقد اصل اور نفع کا تھا، سب صرف ہوا۔ اس بیگانے ملک میں کون اعتبار کرے جو قرض وام سے کام چلے۔ آخر تکلیف روز مرے خرچ کی ہونے لگی۔ اس سے بہت دل گھبرایا۔ فکر سے دبلا ہوتا چلا۔ چہرے کا رنگ کلچھواں ہوگیا۔ لیکن کس سے کہوں؟ جو کچھ دل پہ گزری سو گزری، قہر درویش بر جان درویش۔ ایک دن اُس پری نے اپنے شعور سے دریافت کر کے کہا: "اے فلانے! تیری خدمتوں کا حق ہمارے جی میں نقش کالحجر ہے۔ پر اس کا عوض بالفعل ہم سے نہیں ہوسکتا۔ اگر واسطے خرچ ضروری کے کچھ درکار ہو تو اپنے دل میں اندیشہ نہ کر۔ ایک ٹکڑا کاغذ اور دوات قلم حاضر کر۔"

میں نے تب معلوم کیا کسی ملک کی بادشاہزادی ہے جو اس دل و دماغ سے گفتگو کرتی ہے۔ فی الفور قلمدان آگے رکھ دیا۔ اُس نازنین نے ایک شقہ دستخط خاص سے لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا: "قلعے کے پاس ترپولیا ہے۔ وہاں اُس کوچہ میں ایک حویلی بڑی سی ہے۔ اُس مکان کے مالک کا نام سیدی بہار ہے۔ تو جاکر اس رقعے کو اس تلک پہنچا دے۔"

فقیر موافق فرمانے اُس کے اُسی نام و نشان پر منزل مقصود تک جا پہنچا۔ دربان کی زبانی کیفیت خط کی کہلا بھیجی۔ وونہیں سنتے ہی ایک حبشی جوان خوبصورت ایک پھینٹا طرحدار سجے ہوئے باہر نکل آیا۔ اگرچہ رنگ سانولا تھا پر گویا تمام نمک بھرا ہوا۔ میرے ہاتھ سے خط لے لیا۔ نہ بولا نہ کچھ پوچھا۔ انھیں قدموں پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں گیارہ کشتیاں سر بمہر زربفت کی تورہ پوش پڑے ہوئے غلاموں کے سر پر دھرے باہر آیا اور کہا: "اس جوان کے ساتھ جاکر جوگی کو تمے پہنچا دو۔" میں بھی سلام کر رخصت ہوا

اپنے مکان میں لایا۔ آدمیوں کو دروازہ کے باہر سے رخصت کیا۔ وو کشتیاں امانت حضور میں اُس پری کے گزرانیاں۔ دیکھ کر فرمایا: "لے گیارہ بدرے اشرفیوں کے لے اور خرچ میں لا۔ خدا رزاق ہے۔" فقیر اس نقد کو لے کر ضرورت میں خرچ کرنے لگا۔ اگرچہ خاطر جمع ہوئی پر دل میں یہ خلش رہی یا الٰہی! یہ کیا صورت ہے؟ بغیر پوچھے گچھے اتنا مال ناآشنا صورت اجنبی نے ایک پرزے کاغذ پر میرے حوالے کیا۔ اگر اس پری سے یہ بھید پوچھوں تو اُس نے پہلے ہی منع کر رکھا تھا۔ مارے ڈر کے دم نہیں مار سکتا تھا۔

بعد آٹھ دن کے وہ معشوق مجھ سے مخاطب ہوئی کہ "حق تعالیٰ نے آدمی کو انسانیت کا جامہ عنایت کیا ہے کہ پھٹے نہ میلا ہو۔ اگرچہ پرانے کپڑے سے اُس کی آدمیت میں فرق نہیں آتا، پر ظاہر میں خلق اللہ کی نظروں میں اعتبار نہیں پاتا۔ دو توڑے اشرفیوں کے ساتھ لے کر چوک کے چوراہے پر یوسف سوداگر کی دکان میں جا اور کچھ رقم کے جواہر بیش قیمت اور خلعتیں زرق برق کی مول لے آ۔"

فقیر دو گھیں سوار ہو کر اُس کی دکان پہ گیا۔ دیکھا تو ایک جوان شکیل زعفرانی جوڑا پہنے گدی پر بیٹھا ہے اور اُس کا یہ عالم ہے کہ ایک عالم دیکھنے کے لیے دکان سے بازار تک کھڑا ہے۔ فقیر کمال شوق سے نزدیک جا کر سلام علیک کر کر بیٹھا اور جو جو چیز مطلوب تھی طلب کی۔ میری بات چیت اُس شہر کے باشندوں کی سی نہ تھی اُس جوان نے گرم جوشی سے کہا: "جو صاحب کو چاہیئے سب موجود ہے، لیکن یہ فرمایئے کس ملک سے آنا ہوا؟ اور اس اجنبی شہر میں رہنے کا کیا باعث ہے؟ اگر اس حقیقت سے مطلع کیجیے تو مہربانی سے بعید نہیں۔"

میرے تئیں اپنا احوال ظاہر کرنا منظور نہ تھا کچھ بات بنا کر اور جواہر پوشاک لے کر اور قیمت اُس کی دے کر رخصت چاہی۔ اُس جوان نے روکھے پھیکے ہو کر کہا: "اے صاحب اگر تم کو ایسی ہی ناآشنائی کرنی تھی، تو پہلے دوستی اتنی گرمی سے کرنی کیا ضرور تھی؟ بھلے آدمیوں میں صاحب سلامت کا پاس بہت بڑا ہوتا ہے۔"

یہ بات اس مزے اور انداز سے کہی بے اختیار دل کو بھائی اور بے مروت ہو کر

وہاں سے اٹھنا انسانیت کے مناسب نہ جانا۔ اُس کی خاطر پھر بیٹھا اور بولا: "تمھارا فرمانا سر آنکھوں پر، میں حاضر ہوں۔"

اتنے کہنے سے بہت خوش ہوا ہنس کر کہنے لگا: "اگر آج کے دن غریب خانے میں کرم کیجیے تو تمھاری بدولت مجلس خوشی کی جما دو چار گھڑی دل بہلادیں اور کچھ کھانے پینے کا شغل باہم بیٹھ کر کریں۔"

فقیر نے اُس پری کو کبھو اکیلا نہ چھوڑا تھا۔ اُس کی تنہائی یاد کر کے چند در چند عذر کیے پر اُس جوان نے ہرگز نہ مانا۔ آخر وعدہ اُن چیزوں کو پہنچا کر میرے پھر آنے کا لے کر اور قسم کھا کر رخصت دی۔ میں دکان سے اُٹھ کر جواہر اور خلعتیں اُس پری کی خدمت میں لایا۔ اُس نے قیمت جواہر کی اور حقیقت جوہری کی پوچھی میں نے سارا احوال مول تول کا اور مہمانی کے بضد ہونے کا کہہ سنایا۔ فرمانے لگی: "آدمی کو اپنا قول قرار پورا کرنا واجب ہے۔ ہمیں خدا کی نگہبانی میں چھوڑ کر اپنے وعدے کو وفا کر۔ ضیافت قبول کرنی سنّت رسول ہے۔ تب میں نے کہا: "میرا دل چاہتا نہیں کہ تمھیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں، اور حکم یوں ہوتا ہے، لاچار جاتا ہوں، جب تلک آؤں گا دل یہیں لگا رہے گا۔"

یہ کہہ کر پھر اُس جوہری کی دکان پر گیا۔ وہ مونڈھے پر بیٹھا میرا انتظار کھینچ رہا تھا دیکھتے ہی بولا۔ "آؤ مہربان! بڑی راہ دکھائی۔"

وہیں اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا۔ جاتے جاتے ایک باغ میں لے گیا وہ بڑی بہار کا باغ تھا، حوض اور نہروں میں فوارے چھوٹتے تھے، میوے طرح بہ طرح کے پھل رہے تھے، ہر ایک درخت مارے بوجھ کے جھوم رہا تھا، رنگ برنگ کے جانور اُن پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے، ہر مکان عالیشان میں فرش ستھرا بچھا تھا۔ وہاں لب نہر ایک بنگلے میں جا کر بیٹھا۔ ایک دم کے بعد اُٹھ کر چلا گیا۔ پھر دوسری پوشاک معقول پہن کر آیا۔ میں نے دیکھ کر کہا "سبحان اللہ چشم بد دور۔" سن کر مسکرایا اور بولا۔ "مناسب یہ ہے کہ صاحب بھی اپنا لباس بدل ڈالیں"۔ اُس کی خاطر میں نے بھی دوسرے کپڑے پہنے۔ اُس جوان نے بڑی ٹیپ ٹاپ سے تیاری ضیافت کی کی اور سامان خوشی کا جیسا چاہیئے موجود کیا۔ اور فقیر سے صحبت بہت

گرم گرم مزے کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں ساقی صراحی و پیالہ بلور کا لے کر حاضر ہوا اور گزک کئی قسم کی لا کے رکھی۔ نمکدان چن دیئے۔ دورِ شراب کا شروع ہوا۔ جب دو چار جام کی نوبت پہنچی۔ چار لڑکے امرد صاحب جمال زلفیں کھولے ہوئے مجلس میں آئے، گانے بجانے لگے۔ یہ عالم ہوا اور ایسا سماں بندھا اگر تان سین اُس گھڑی ہوتا تو اپنی تان بھول جاتا اور بیجو باؤرا سُن کر باؤلا ہو جاتا۔ اس مزے میں ایک بارگی وہ جوان آنسو بھر لایا۔ دو چار قطرے بے اختیار نکل پڑے اور فقیر سے بولا "اب ہماری تمہاری دوستی جانی ہوئی پس دل کا بھید دوستوں سے چھپانا کسو مذہب میں درست نہیں ایک بات بے تکلف آشنائی کے بھروسے کہتا ہوں۔ اگر حکم ہو تو اپنی معشوقہ کو بلوا کر اس مجلس میں تسلی اپنے دل کو کروں اس کی جدائی سے جی نہیں لگتا"۔

یہ بات ایسے اشتیاق سے کہی کہ بغیر دیکھے بھالے فقیر کا دل بھی مشتاق ہوا میں نے کہا "مجھے تمہاری خوشی درکار ہے۔ اس سے کیا بہتر؟ دیر نہ کیجیے یہ معشوق بن کچھ اچھا نہیں لگتا"۔

اُس جوان نے چلون کی طرف اشارت کی۔ وونہیں ایک عورت کالی کلوٹی بھتنی سی جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل مر جاوے، جوان کے پاس آن بیٹھی۔ فقیر اُس کے دیکھنے سے ڈر گیا۔ دل میں کہا یہی بلا محبوبہ ایسے جوان پری زاد کی ہے جس کی اتنی تعریف اور اشتیاق ظاہر کیا۔ میں لاحول پڑھ کر چپ ہو رہا۔ اُسی عالم میں تین دن رات مجلس شراب اور راگ رنگ کی جمی رہی۔ چوتھی شب کو غلبہ نشہ اور نیند کا ہوا میں خواب غفلت میں بے اختیار سو گیا۔ جب صبح ہوئی اُس جوان نے جگایا کئی پیالے خمار شکنی کے پلا کر اپنی معشوقہ سے کہا، اب زیادہ تکلیف اپنے مہمان کو دینی خوب نہیں۔

دونوں ہاتھ پکڑ کر اُٹھے میں نے رخصت مانگی۔ خوشی بہ خوشی اجازت دی۔ تب میں نے جلد اپنے قدیمی کپڑے پہن لیے اپنے گھر کی راہ لی۔ اور اُس پری کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ مگر ایسا اتفاق کبھو نہ ہوا تھا کہ اُسے تنہا چھوڑ کر شب باشی کہیں ہوا ہوں۔ اس تین دن کی غیر حاضری سے نہایت خجل ہو کر عذر کیا۔ اور قصہ ضیافت کا اور اُس کے نہ

رخصت کرنے کا سارا عرض کیا۔ وہ ایک دانا زمانے کی تھی۔ تبسّم کرکے بولی "کیا مضائقہ ہے اگر ایک دوست کی خاطر رہنا ہوا ہم نے معاف کیا۔ تیری کیا تقصیر ہے؟ جب آدمی کسو کے گھر جاتا ہے تب اُس کی مرضی سے پھر آتا ہے لیکن یہ مفت کی مہمانیاں کھاپی کر چپکے ہو رہو گے یا اُس کا بدلہ بھی اُتارو گے؟ اب یہ لازم ہے کہ جا کر اُس سوداگر بچے کو اپنے ساتھ لے آؤ اور اُس سے دو چند ضیافت کرو اور اسباب کا کچھ اندیشہ نہیں، خدا کے کرم سے ایک دم میں سب لوازمہ تیار ہو جاوے گا اور بہ خوبی مجلس ضیافت کی رونق پاوے گی"۔

فقیر موافق حکم کے جوہری پاس گیا اور کہا "تمھارا فرمانا تو میں سر آنکھوں سے بجا لایا اب تم بھی مہربانی کی راہ سے میری عرض قبول کرو" اُس نے کہا" دل وجان سے حاضر ہوں" تب میں نے کہا" اگر اس بندے کے گھر تشریف لے چلو، عین غریب نوازی ہے"۔ اس جوان نے بہت عذر اور حیلے کیے۔ پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا جب تلک وہ راضی نہ ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کو اپنے مکان پہ لے چلا۔ لیکن راہ میں یہی فکر کرتا تھا کہ اگر آج اپنے تئیں مقدور ہوتا تو ایسی تواضع کرتا کہ یہ بھی خوش ہوتا۔ اب میں اسے لیے جاتا ہوں۔ دیکھیے کیا اتفاق ہوتا ہے۔ اسی حیص بیص میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں؟ کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے۔ گلیارے میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا ہے۔ یساول اور عصا بردار کھڑے ہیں۔ میں حیران ہوا۔ لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا۔ دیکھا تو تمام حویلی میں فرش مکلف لائق ہر مکان کے جابجا بچھا ہے۔ اور مسندیں لگی ہیں۔ پاندان، گلاب پاش، عطردان، پیک دان چنگیرین، نرگس دان قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں میں رنگترے، کنونے، نارنگیاں اور گلابیاں رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کے ٹیٹوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ ایک طرف جھاڑ اور سرو کنول کے روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں۔ اور جڑاؤ فانوسیں اوپر دھری ہیں۔ سب آدمی اپنے اپنے عہدوں پر مستعد ہیں۔ باورچی خانے میں دیگیں ٹھنٹھنا رہی

ہیں، آبدار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے۔ کوری کوری ٹھلیاں روپے کی گھڑونچیوں پر صافیوں سے بندھیں، اور جھجروں سے ڈھکی رکھی ہیں۔ آگے چوکی پر ڈونگے کٹورے بمعہ تھالی، سرپوش دھرے، برف کے آبخورے لگ رہے ہیں۔ اور شورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں۔

غرض سب اسباب پادشاہانہ موجود ہے، اور کنچنیاں، بھانڈ، بھگتیے، کلاونت قوال اچھی پوشاک پہنے سازکے سر ملائے حاضر ہیں۔ فقیر نے اُس جوان کو لے جا کر مسند پر بٹھایا اور دل میں حیران تھا کہ یا الٰہی! اتنے عرصے میں یہ سب تیاری کیوں کر ہوئی؟ ہر طرف دیکھتا پھرتا تھا۔ لیکن اُس پری کا نشان کہیں نہ پایا۔ اسی جستجو میں ایک مرتبہ باورچی خانے کی طرف جا نکلا۔ دیکھتا ہوں تو وہ نازنین ایک مکان میں گلے میں کرتی، پاؤں میں تہ پوشی، سر پر سفید رومالی اوڑھے ہوئے سادی خوزادی بن گہنے پاتے بنی ہوئی:

نہیں محتاج زیور کا، جسے خوبی خدا نے دی
کہ جیسے خوش نما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے

خبر گیری میں ضیافت کے لگ رہی ہے۔ اور تاکید ہر ایک کھانے کی کر رہی ہے کہ خبردار بامزہ ہو۔ اور آب و نمک بوباس درست رہے۔ اس محنت سے وہ گلاب سا بدن سارا پسینہ پسینہ ہو رہا ہے۔

میں پاس جا کر تصدق ہوا اور اس شعور و لیاقت کو سراہ کر دعائیں دینے لگا۔ یہ خوشامد سُن کر تیوری چڑھا کر بولی:۔ "آدمی سے ایسے کام ہوتے ہیں کہ فرشتے کی مجال نہیں۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے جو تو اتنا حیران ہو رہا ہے؟ بس بہت سی باتیں بنانی مجھے خوش نہیں آتیں۔ بھلا کہہ تو یہ کون آدمیت ہے کہ مہمان اکیلا بٹھلا کر اِدھر اُدھر پڑے پھرے؟ وہ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا؟ جلد جا مجلس میں بیٹھ کر مہمان کی خاطر داری کر، اور اُس کی معشوقہ کو بھی بلوا کر اُس کے پاس بٹھلا"۔ فقیر وہیں اُس جوان کے پاس گیا اور گرم جوشی کرنے لگا۔ اتنے میں دو غلام صاحب جمال صراحی اور

جام جڑاؤ ہاتھ میں لیے روبرو آئے، شراب پلانے لگے۔ اس بیچ میں نے اس جوان سے کہا: "میں سب طرح مخلص اور خادم ہوں، بہتر یہ ہے کہ وہ صاحب جمال کہ جس کی طرف دل صاحب کا مائل ہے تشریف لاوے تو بڑی بات ہے۔ اگر فرماؤ تو آدمی بلانے کی خاطر جاوے" یہ سنتے ہی خوش ہو کر بولا "بہت اچھا" اس وقت تم نے میری دل کی بات کہی" میں نے ایک خوجے کو بھیجا۔ جب آدھی رات گئی وہ چڑیل خاصے چوڈول پر سوار ہو کر بلائے ناگہانی سی آ پہنچی۔

فقیر نے لاچار خاطر سے مہمان کی استقبال کر کر نہایت تپاک سے برابر اس جوان کے لا بٹھلایا۔ جوان اس کو دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا جیسے دنیا کی نعمت ملی۔ وہ بھتنی بھی اس جوان پری زاد کے گلے لپٹ گئی۔ سچ مچ یہ تماشا ہوا جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے۔ جتنے مجلس میں آدمی تھے۔ اپنی اپنی انگلیاں دانتوں میں دابنے لگے کہ کیا کوئی بلا اس جوان پر مسلط ہوئی؟ سب کی نگاہ اسی طرف تھی۔ تماشا مجلس کا بھول کر اس کا تماشا دیکھنے لگے۔ ایک شخص کنارے سے بولا: "یارو! عشق اور عقل میں ضد ہے جو کچھ عقل میں نہ آوے یہ کافر عشق کر دکھاوے' لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھو۔ سبھوں نے کہا "آمنا' یہی بات ہے"۔

یہ فقیر بہ موجب حکم مہمان داری میں حاضر تھا۔ پھر چند جوان ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے کو مجوز ہوتا تھا پر میں ہرگز اس پری کے خوف کے مارے اپنا دل کھانے پینے یا سیر تماشے کی طرف رجوع نہ کرتا تھا اور نہ عذر مہمانداری کا کر کے اس کے شامل نہ ہوتا۔ اسی کیفیت سے تین شبانہ روز گزرے۔ چوتھی رات وہ جوان نہایت جوش سے مجھے بلا کر کہنے لگا۔ "اب ہم رخصت ہوں گے تمھاری خاطر اپنا سب کاروبار چھوڑ کر تین دن سے تمھاری خدمت میں حاضر ہیں۔ تم بھی تو ہمارے پاس ایک دم بیٹھ کر ہمارا دل خوش کرو"۔ میں نے اپنے جی میں خیال کیا اگر اس وقت کہا اس کا نہیں مانتا تو آزردہ ہو گا' پس نے "دوست اور مہمان کی خاطر رکھنی ضرور ہے تب یہ کہا: "صاحب کا حکم بجا لانا منظور کہ الامر فوق الادب" سنتے ہی اس جوان نے پیالہ تواضع کیا اور میں نے پی لیا۔ پھر تو ایسا پیہم دور چلا کر تھوڑی

دیر میں سب آدمی مجلس کے کیفی ہو کر بے خبر ہو گئے اور میں بے ہوش ہو گیا۔

جب صبح ہوئی اور آفتاب او۔ دو نیزے بلند ہوا۔ تب میری آنکھ کھلی تو دیکھا میں نے نہ وہ تیاری ہے، نہ وہ مجلس، نہ پری۔ فقط خالی حویلی پڑی ہے مگر ایک کونے میں کمل لپٹا ہوا دھرا ہے۔ جو اُس کو کھول کر دیکھا تو وہ جوان اور اُس کی رنڈی دونوں کے سر کٹے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی حواس جاتے رہے عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ کیا تھا اور یہ کیا ہوا؟ حیرانی سے ہر طرف تک رہا تھا۔ اتنے میں ایک خواجہ سرا (جسے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا) نظر پڑا۔ فقیر کو اُس کے دیکھنے سے کچھ تسلی ہوئی۔ احوال اس واردات کا پوچھا۔ اُس نے جواب دیا۔ "تجھے اس بات کی تحقیق کرنے سے کیا حاصل جو تو پوچھتا ہے؟" میں نے بھی اپنے دل میں غور کی کہ سچ تو کہتا ہے۔ پھر ایک ذرا تامل کر کے میں بولا "خیر نہ کہو، بھلا یہ تو بتاؤ وہ معشوق کس مکان میں ہے" تب اُس نے کہا: "البتہ جو میں جانتا ہوں سو کہہ دوں گا۔ لیکن تجھ سا آدمی عقل مند بے مرضی حضور کے دو دن کی دوستی پر بے محابا بے تکلف ہو کر صحبت مے نوشی کی باہم گرم کرے۔ یہ کیا معنی رکھتا ہے؟"

فقیر اپنی حرکت اور اُس کی نصیحت سے بہت نادم ہوا۔ سوائے اس بات کے زبان سے کچھ نہ نکلا۔ "فی الحقیقت اب تو تقصیر ہوئی معاف کیجیے" بارے محلی نے مہربان ہو کر اُس پری کے مکان کا نشان بتایا اور مجھے رخصت کیا۔ آپ اُن دونوں زخمیوں کے گاڑنے دابنے کی فکر میں رہا۔ میں تہمت سے اس فساد کے الگ ہوا اور اشتیاق میں اُس پری کے ملنے کے لیے گھبرایا ہوا گرتا پڑتا ڈھونڈھتا شام کے وقت اس کوچے میں اُسی پتے پر جا پہنچا اور نزدیک دروازے کے ساری رات تلملاتے کٹی۔ کسو کی آمد و رفت کی آہٹ نہ ملی اور کوئی احوال پرساں میرا نہ ہوا۔ اُسی بیکسی کی حالت میں صبح ہو گئی، جب سورج نکلا اُس مکان کے بالاخانے کی ایک کھڑکی سے وہ ماہ رو میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس وقت عالم خوشی کا جو مجھ پر گزرا دل ہی جانتا ہے۔ شکر خدا کا کیا۔

اتنے میں ایک خوجے نے میرے پاس آکر کہا: "اُس مسجد میں تو جا کر بیٹھ۔ شاید

تیرا مطلب اس جگہ بر آوے اور اپنے دل کی مراد پاوے"۔ فقیر فرمانے سے اُس کے وہاں سے اُٹھ کر اُسی مسجد میں جا رہا، لیکن آنکھیں دروازے کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ تمام دن جیسے روزہ دار شام ہونے کا انتظار کھینچتا ہے، میں نے بھی وہ روز ویسی ہی بے قراری میں کاٹا۔ بارے جس تس طرح سے شام ہوئی اور دن پہاڑ سا چھاتی پر سے ٹلا۔ ایک بارگی وہی خواجہ سرا (جس نے اُس پری کے مکان کا پتا بتایا تھا) مسجد میں آیا۔ بعد فراغت نماز مغرب کے میرے پاس آکر اُس شفیق نے (کہ سب راز و نیاز کا محرم تھا)، نہایت تسلی دے کر ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا۔ رفتہ رفتہ ایک باغیچے میں مجھے بٹھا کر کہا۔ "یہاں رہو جب تک تمھاری آرزو بر آوے" اور آپ رخصت ہو کر شاید میری حقیقت حضور میں کہنے گیا۔ میں اُس باغ کے پھولوں کی بہار اور چاندنی کا عالم اور حوض نہروں میں فوارے، ساون بھادوں کے اچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا، لیکن جب پھولوں کو دیکھتا تب اس گل بدن کا خیال آتا۔ جب چاند پر نظر پڑتی تب اُس مہ رو کا مکھڑا یاد کرتا۔ یہ سب بہار اُس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی۔

بارے خدا نے اُس کے دل کو مہربان کیا۔ ایک دم کے بعد وہ پری دروازے سے جیسے چودھویں رات کا چاند بناؤ کیے گلے میں پشوازِ، بادلے کی سنجاف کی موتیوں کا دردامن ٹکا ہوا اور سر پر اوڑھنی جس میں آنچل پلو لہر گوکھرو لگا ہوا۔ سر سے پاؤں تک موتیوں میں جڑی روشں پر آکر کھڑی ہوئی اُس کے آنے سے تروتازگی نئے سرے سے اس باغ کو اور اس فقیر کے دل کو ہو گئی۔ ایک دم ادھر اُدھر سیر کر کر شہ نشین میں مخرق مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھی۔ میں دوڑ کر پروانے کی طرح جیسے شمع کے گرد پھرتا ہے تصدق ہوا۔ اور غلام کی مانند دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا۔ اس میں وہ خوجہ میری خاطر بطور سفارش کے عرض کرنے لگا۔ میں نے اس محلی سے کہا: بندہ گنہگار تقصیر وار ہے جو کچھ سزا میرے لائق ٹھہرے سو ہو"۔ وہ پری از بسکہ ناخوش تھی، بددماغی سے بولی کہ: "اب اس کے حق میں یہی بھلا ہے کہ سو توڑے اشرفی کے لیوے، اپنا اسباب درست کر کے وطن کو سدھارے"۔

میں یہ بات سنتے ہی کاٹھ کا ہوگیا اور سوکھ گیا کہ اگر کوئی میرے بدن کو کاٹے تو ایک بوند لہو کا نہ نکلے، اور تمام دنیا آنکھوں کے آگے اندھیری لگنے لگی۔ اور ایک آہ نامرادی کی بے اختیار جگر سے نکلی۔ آنسو بھی ٹپکنے لگے۔ سوائے خدا کے اُس وقت کسو کی توقع نہ رہی مایوس محض ہو کر اتنا بولا: بھلا ٹک اپنے دل میں غور فرمائیے، اگر مجھ کم نصیب کو دنیا کا لالچ ہوتا تو اپنا جان و مال حضور میں نہ کھوتا۔ کیا ایک بارگی حق خدمت گذاری اور جاں نثاری کا عالم سے اٹھ گیا۔ جو مجھ سے کم بخت پر اتنی بے مہری فرمائی۔ خیر اب میرے تئیں بھی زندگی سے کچھ کام نہیں۔ معشوقوں کی بے وفائی سے بے چارے عاشق نیم جاں کا نباہ نہیں ہوتا۔"

یہ سن کر وہ تیکھی ہو تیوری چڑھا کر خفگی سے بولی: "چہ خوش" آپ ہمارے عاشق ہیں، مینڈکی کو بھی زکام ہوا؟ اے بے وقوف! اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانیں خیال خام ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ اس لیے چپ رہ۔ یہ نکمی بات چیت مت کر۔ اگر کسی اور نے یہ حرکت بے معنی کی ہوتی پروردگار کی سوں اس کی بوٹیاں کٹوا چیلوں کو بانٹتی، پر کیا کروں تیری خدمت یاد آتی ہے۔ اب اسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے تیری قسمت کا دانہ پانی ہماری سرکار میں یہیں تلک تھا۔"

پھر میں نے روتے بسورتے کہا: "اگر میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ اپنے دل کے مقصد کو نہ پہنچوں اور جنگل پہاڑ میں سر ٹکراتا پھروں تو لاچار ہوں"۔ اس بات سے بھی دق ہو کر کہنے لگی: "میرے تئیں یہ پھساھندی چوچلے اور رمز کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ اس اشارے کی گفتگو کی جو لائق ہو اس سے جا کر کر"۔ پھر اُسی خفگی کے عالم میں اٹھ کر اپنے دولت خانے کو چلی۔ بہتیرا سر پٹکا متوجہ نہ ہوئی۔ لاچار میں بھی اُس مکان سے اُداس اور ناامید ہو کر نکلا۔

غرض چالیس دن تک یہی نوبت رہی۔ جب شہر کی کوچہ گردی سے اکتاتا جنگل میں نکل جاتا۔ جب وہاں سے گھبراتا پھر شہر کی گلیوں میں دیوانہ سا آتا۔ نہ دن کو کھاتا نہ رات کو سوتا، جیسے دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ زندگی انسان کی کھانے پینے سے ہے، آدمی

اناج کا کیڑا ہے۔ طاقت بدن میں مطلق نہ رہی، اپاہج ہو کر اسی مسجد کی دیوار کے تلے جا پڑا کہ ایک روز وہی خواجہ سرا جمعہ کی نماز پڑھنے آیا۔ میرے پاس سے ہو کر چلا۔ میں یہ شعر آہستہ ناطاقتی سے پڑھ رہا تھا۔

اس درد دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو
قسمت میں جو لکھا ہو الٰہی شتاب ہو

اگرچہ ظاہر میں صورت میری بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ چہرے کی یہ شکل بنی تھی کہ جن نے مجھے پہلے دیکھا تھا وہ بھی نہ پہچان سکا کہ یہ وہی آدمی ہے، لیکن وہ محلی آواز درد سن کر متوجہ ہوا۔ میرے تئیں بغور دیکھ کر افسوس کیا اور شفقت سے مخاطب ہوا کہ آخر یہ حالت اپنی پہنچائی۔ میں نے کہا۔ "اب تو جو ہوا سو ہوا، مال سے بھی حاضر تھا جان بھی تصدق کی۔ اس کی خوشی یوں ہی ہوئی تو کیا کروں"

یہ سن کر ایک خدمت گار میرے پاس چھوڑ کر مسجد میں گیا، نماز اور خطبے سے فراغت کر کر جب باہر نکلا، فقیر کو ایک میانے میں ڈال کر اپنے ساتھ خدمت میں اس پری بے پروا کی لے جا کر چق کے باہر بٹھایا۔ اگرچہ میری رو بٹ کچھ باقی نہ رہی تھی۔ پر مدت تلک شب و روز اس پری کے پاس اتفاق رہنے کا ہوا تھا۔ جان بوجھ کر بیگانی ہو کر خوجے سے پوچھنے لگی۔ "یہ کون ہے؟" اس مرد آدمی نے کہا: "یہ وہی کم بخت بدنصیب ہے جو حضور کی خفگی اور عتاب میں پڑا تھا۔ اسی سبب سے اس کی یہ صورت بنی ہے۔ عشق کی آگ سے جلا جاتا ہے۔ ہر چند آنسوؤں کے پانی سے بجھاتا ہے پر وہ دونی بھڑکتی ہے۔ کچھ فائدہ نہیں ہوتا علاوہ وہ اپنی تقصیر کی خجالت سے موا جاتا ہے۔" پری نے ٹھٹھولی سے فرمایا "کیوں جھوٹ بکتا ہے۔ بہت دن ہوئے اس کی خبر وطن پہنچنے کی مجھے خبرداروں نے دی ہے۔ واللہ اعلم یہ کون ہے اور تو کس کا ذکر کرتا ہے؟" اس دم خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر التماس کیا: "اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں" فرمایا "تیری جان تجھے بخشی" خواجہ بولا: "آپ کی ذات قدرداں ہے۔ واسطے خدا کے چلون کو درمیان میں سے اٹھوا کر پہچانیے

اور اس کی بے کسی کی حالت پر رحم کیجے۔ ناحق شناسی خوب نہیں۔ اب اس کے احوال پر جو کچھ ترس کھائیے بجا ہے اور جائے ثواب ہے۔ آگے حد ادب، جو مزاج مبارک میں آوے سو وہی بہتر ہے۔"

اتنے کہنے پر مسکرا کر فرمایا: "بھلا کوئی ہو، اسے دارالشفا میں رکھو، جب بھلا چنگا ہو گا تب اُس کے احوال کی پرسش کی جائے گی۔" خوجے نے کہا۔ اگر اپنے دست خاص سے گلاب اس پر چھڑکیے اور زبان سے کچھ فرمایئے تو اس کو اپنے جینے کا بھروسا بندھے، ناامیدی بری چیز ہے۔ دنیا بہ امید قائم ہے،" اس پر بھی اس پری نے کچھ نہ کہا۔ یہ سوال و جواب سن کر میں بھی اپنے جی سے اکتا رہا تھا، ندھڑک بول اٹھا "اب اس طور کی زندگی کو دل نہیں چاہتا۔ پاؤں تو گور میں لٹکا چکا ہوں۔ ایک روز مرنا ہے اور علاج میرا پادشاہ زادی کے ہاتھ میں ہے۔ کریں یا نہ کریں وہ جانیں"۔ بارے پھر مقلب القلوب نے اس سنگدل کے دل کو نرم کیا، مہربان ہو کر فرمایا۔ جلد بادشاہی حکیموں کو حاضر کرو۔ وہ بھیں طبیب آ کر جمع ہوئے، نبض قارورہ دیکھ کر بہت غور کی۔ آخر یہ تشخیص میں ٹھہرا کہ یہ شخص کہیں عاشق ہوا ہے، سوائے وصل معشوق کے اس کا کچھ علاج نہیں۔ جس وقت وہ ملے صحت پاوے۔ جب حکیموں کی زبانی بھی یہی مرض ثابت ہوا حکم کیا، اس جوان کو گرمابے میں لے جاؤ۔ نہلا کر خاصی پوشاک پہنا کر حضور میں لے آؤ۔ وہ بھیں مجھے باہر لے گئے۔ حمام کروا اچھے کپڑے پہنا، خدمت میں پری کی حاضر کیا۔ تب وہ نازنین تپاک سے بولی۔ "تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے ناحق بدنام اور رسوا کیا اب اور کیا چاہتا ہے؟ جو تیرے دل میں ہے صاف صاف بیان کر۔"

یا فقرا! اُس وقت یہ عالم ہوا کہ شادی مرگ ہو جاؤں۔ خوشی کے مارے ایسا پھولا کہ جامے میں نہ سماتا تھا۔ اور صورت شکل بدل گئی شکر خدا کا کیا اور اس سے کہا۔ "اس دم ساری حکیمی آپ پر ختم ہوئی کہ مجھ سے مردے کو ایک بات میں زندہ کیا۔ دیکھو تو اُس وقت سے اس وقت تک میرے احوال میں کیا فرق ہو گیا؟

یہ کہہ کر تین بار گرد پھرا اور سامنے آ کر کھڑا ہوا اور کہا۔ "حضور سے یوں حکم ہوتا ہے کہ جو تیرے جی میں ہو سو کہہ۔ بندے کو ہفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ یہ ہے کہ غریب نوازی کر کر اس عاجز کو قبول کیجے اور اپنی قدم بوسی سے سرفرازی دیجئے" ایک لمحہ توسن کر غوطے میں گئی پھر کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا" بیٹھو" تم نے خدمت وفاداری ایسی ہی کی ہے۔ خیر ہم نے قبول کیا۔"

○

فسانۂ عجائب

(رجب علی بیگ سرور)

جان عالم کا طوطا خریدنا

بلبل نوا سنج ہزار داستان، طوطی خامہ زمزمہ ریز خوش بیان گلشن تقریر میں یوں چہکا ہے کہ بعد رسم شادی، سیر و شکار کی اجازت، سواری کا حکم، شاہ ذوی الاقتدار سے حاصل ہوا۔ گاہ گاہ شام دپگاہ جان عالم سوار ہونے لگا۔

ایک روز گذر اُسی گڈری میں ہوا۔ انبوہ کثیر جم غفیر نظر آیا اور غلغلۂ تحسین و آفرین از زمین تا چرخ بریں بلند پایا۔ شہزادہ ادھر متوجہ ہوا۔ دیکھا کہ ایک پیر مرد نحیف ستر اسی برس کا سن نہایت ضعیف پنجرا ہاتھ میں لیے کھڑا ہے۔ اُس میں ایک جانور مانند سالکاں جناں سبز پوش، طائر بے مروت، خانہ بدوش بامنقار گلنار لطیفے رنگین اور نکتے قابل تعریف نمکین، مثال طوطی پس آئینہ بیان کرتا ہے۔ لا اعلم۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

شہزادے کے دیکھتے ہی توتا اپنے مالک سے بولا: "اے شخص! کوکب بخت تیرا افلاس کے برج تیرہ سے نکلا۔ نصیب چمکا۔ طالع برسر یاری۔ زمانہ آمادۂ مدد" ہے۔ دیکھ! ایسا شہزادہ حاتم شعار، ابر گہربار متوجہ اس مشت پر ذرۂ بے مقدار پر ہوا ہے۔ وہ بے کار شے کار گاہ بے ثبات میں ہوں جس کا طالب نہیں کہیں۔ بجدے کہ جانور ہوں اور بلی کا کھاجا مگر جو یہ نظر عنایت کرے ابھی تیرا ہاتھ پُر زر ہو، دامن گہر سے بھرے" جان عالم نے یہ سخن ہوش ربا، کلمۂ حیرت افزا سنے۔ توتے عقل کے اڑے پنجرا اس طائر ہمہ داں جانور سحر بیاں کا ہاتھ میں لے کے مالک سے قیمت پوچھی

توتے نے کہا۔ مولف :

کب لگاتا ہے کوئی اس دل بے حال کا مول

سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول

مگر حضور کی مرضی ۔ جان عالم نے لاکھ روپے خلعت کے سوا عنایت کیے اور پنجرہ ہاتھ میں لیے دولت سرا کو روانہ ہوا ۔ گھر میں جا ماہ طلعت کو دیکھا یہ مصرعہ انشا کا پڑھا

بازار ہم گئے تھے اک چوٹ مول لائے

توتے نے شہزادے کو سخنان دل چسپ، قصص عجیب، حکایت غریب، شعر خوب لطیفہائے مرغوب سنا اپنے دام محبت میں اسیر کیا ۔ یہ نوبت پہنچی کہ سوتے جاگتے دربار کے سوا جدا نہ ہوتا ۔ جب دربار جاتا پنجرا بہ حفاظت ماہ طلعت کو سونپ جاتا اور دربار سے دیوانہ وار بشوق گفتار بے قرار جلد پھر آتا ۔

ایک دن شہزادہ دربار گیا، توتا محل میں رہا ۔ اُس روز ماہ طلعت نے غسل کیا اور لباس مکلف سے جسم آراستہ زیور پر تکلف سے پیراستہ ہو جواہر نگار کرسی پر بیٹھی ۔ ہوا جو نگی آئینے میں صورت دیکھ، خود محو تماشا ہوئی ۔ بحر عجب و نخوت میں آشنا ہوئی ۔ خواصوں سے جلیسوں سے، جو جو دمساز محرم راز تھیں اپنے حسن کی داد چاہی ہر ایک نے موافق عقل شعور تعریف کی ۔ کسی نے کہا : "ہلال عید ہو" کوئی بولی "نہ دیدہ ہو نہ شنیدہ ہو" اللہ تعالیٰ نے بایں کثرت مخلوقات تمہارا ہمسر از قسم جن و بشر بنایا نہیں ۔ پری نے یہ قد بالا، حور نے یہ حسن کا جھمکڑا پایا نہیں " جب وہ کہہ چکیں ماہ طلعت نے کہا توتا بہت عقل مند ذی شعور سیاح نزدیک و دور ہے اس سے بھی پوچھنا ضرور ہے ۔ مخاطب ہوئی کہ "اے مرغ خوش خو! وطائر زمرد لباس سرخرو! بذلہ سنج! سچ کہنا اس سج دھج کی صورت کبھی تیرے طائر وہم و خیال کی نظر سے گزری ہے ؟ نیرنگی چرخ کج رفتار، فتنہ پردازی گردوں واژون عیاں شے ۔ آگاہ سب جہاں ہے ۔ اس وقت توتا رنجیدہ دل، کبیدہ خاطر مضمحل بیٹھا تھا ۔ چپ ہو رہا ۔ شہزادی نے پھر پوچھا توتے نے بے اعتنائی سے کہا : "ایسا ہی ہوگا" ۔ یہ رنڈی معشوق مزاج، طرہ یہ کہ شہزادے کی جورو، شوہر مالک تخت

وتاج۔ برہم ہو کے بولی: "میاں مٹھو"! جینے سے خفا ہو؟ جو ہمارے رو برو چپاچپا کر گفتگو کرتے ہو؟" توتے نے کہا: سوال و جواب اور دھمکانا اور حکومت سے ڈرانا، غصے کی آنکھ دکھانا اور ہے کیوں الجھتی ہو شاید تم ہی سچی ہو" پھر تو شعلہ غضب کا کانوں میں شہزادی کے مشتعل ہوا کہا۔ "کیوں جانور! بے تمیز ناچیز توری موت آئی ہے؟ کیا بے ہودہ ٹیں ٹیں مچائی ہے؟ واہی بک رہا ہے۔ ہمارا مرتبہ نہیں سمجھتا ہے؟" توتے کے منہ سے نکلا: "کیوں اتنی خفا ہوتی ہو؟ اپنا منہ ملاحظہ کرو، صاحب تم بڑی خوبصورت ہو"۔ یہاں یہ حیص بیص تھی کہ جان عالم تشریف فرما ہوا عجب صحبت دیکھی کہ شہزادی بچشم پر آب و بادل کباب، غیظ میں آ، تھراتھرا، توتے سے بحث رہی ہے۔ شہزادے نے فرمایا۔ "خیر باشد" توتا بولا "آج نزاشر ہے خیر بجز، مگر چندے حیات مستعار اس وحشی کی اور آب و دانہ قفس پینا کھانا باقی تھا، اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے، تشریف نہ لاتے تو میں، طائر روح گربۂ غضب شہزادی سے مجروح ہو کر پرواز کر جاتا۔ ہرگز جیتا نہ پاتے۔ مگر پنجرا خالی دیکھ کر مزاج پریشان ہوتا بحسرت وافسوس یہ فرماتے۔ الشا: توتا ہمارا مرگیا کیا بولتا ہوا۔ ماہ طلعت ان باتوں سے زیادہ مکدر ہوئی۔ شہزادے سے کہا" اگر میری بات کا توتا جواب صاف نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلووں سے اس کی آنکھیں ملوں گی جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی" جان عالم نے کہا: کچھ حال تو کہو؟" توتے نے گزارش کی: "حضور! یہ مقدمہ غلام سے سنیے۔ آج شہزادی صاحب اپنی دانست میں بہت نکھر، بقا۔ "دیکھ آئینے کو کہتی کہ اللہ رے میں" مجھ سے فرمایا تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی ہے؟ مجھ اجل رسیدہ کے منہ سے نکلا خدا نہ کرے۔ اس جرم قبیح پر شہزادی کے نزدیک کشتنی سوختنی گردن زدنی ہوں بقول میر تقی میر، شعر:

بے خبر تہ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو
کچھ بات بری منہ سے نہ نکلی تھی بھلے کو

جان عالم نے کہا" تم بھی کتنی عقل سے خالی حمق سے بھری ہو تم تو پری ہو، جانور کی بات پر اتنا آزردہ ہو، گو گویا ہے پھر طائر ہے"۔ میاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی۔ آنکھ

بدل کر روکھی صورت بنائی اور ٹیں سے بولا "خداوند نعمت! جھوٹ جھوٹ ہے سچ سچ ہے۔ ہمسر جس کا کوئی نہیں ہے وہ ذات وحدہ لاشریک لہ کی ہے۔ اس کے سوا ایک سے ایک بہتر اور برتر ہے۔ وہ خود فرماتا ہے۔ فضلنا بعضکم علی بعض۔ میں نے تو جھوٹ اور سچ دونوں سے بچ کر ایک کلمہ کہا تھا۔ اگر راستی پر ہوتا گردن کج کیے سیدھا گور میں سوتا"۔ یہ سن کر وہ اور رنجور ہوئی مثل مشہور ہے۔ راج ہٹ، تریاہٹ، بالک ہٹ۔ جان عالم نے مجبور ہو کے کہا "جو ہو سو ہو مٹھو پیارے سچ کہہ دو"۔ توتے نے بہ منت عرض کی"۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز، مجھ سے سچ نہ بلوایئے۔ میرا منہ نہ کھلوایئے۔ نہیں انجام راستی حضور کے دشمنوں کو دشت نوردی، بادیہ پیمائی، غریب الوطنی، کوچہ گردی نصیب ہوگی" شہزادے نے کہا "یہ جملہ تم نے اور نیا سنایا، اب جو کچھ کہنا ہے کہا چاہیے۔ باتیں بہت نہ بنایئے"۔ اس نے کہا: میں نے ہرچند چاہا کہ آپ رنج، سفر، مصائب شہر بہ شہر ایذائے غربت سے باز رہیں کہ سفر اور سقر کی صورت ایک ہے۔ اس سے بچنا نیک ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ حضور کے مقدر میں یہ امر لکھا ہے، میرا قصور اس میں کیا ہے۔ رفیع سودا:

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزن تدبیر ساری عمر گو سیتی رہے

سنیے قبلۂ عالم! یہاں سے برس دن کی راہ شمال میں ایک ملک ہے عجائب روزگار، ایسا خطہ ہے کہ مرقع خیال مانی و بہزاد میں نہ کھنچا ہوگا اور پیر دہقان فلک نے مزرعۂ عالم میں نہ دیکھا ہوگا۔ شہر خوب، آبادی مرغوب، رنڈی مرد حسین طرح دار مکان بلور کے بلکہ نور کے، جواہر نگار، عقل باریک بیں انگشت بدنداں مشاہدے سے دنگ ہو، خلقت اس کثرت سے بسی ہے کہ بستی میں وہم و فکر کو عرصہ تنگ ہو۔ خورشید ہر سحر اس کے دروازے سے ضیا پاتا ہے، بدر کامل اس شہر میں غیرت سے کاھیدہ ہو، ہلال نظر آتا ہے، وہاں کی شہزادی ہے انجمن آرا۔ اس کا تو کیا کہنا۔ کہاں میری زبان میں طاقت اور دھان میں طلاقت جو شمۂ مذکور شکل و شمائل اس زہرہ جبیں فخر لعبتان لندن و چین کا سناؤں۔

استاد :

ایک میں کیا، خوب کر دیکھے اُسے حسن آفریں
اپنی صنائی پہ حیراں خود وہ صورت گر رہے

لیکن سات سو خواص زریں کمر، تاج دلبری برسر، ماہ رو، عنبریں مو سرگروہ خوبان جہان، جان جاں، آرام دل مشتاقاں، اُس کی خدمت میں شب و روز سرگرم خدمت گزاری بڑی تیاری سے رہتی ہیں اگر ان کی لونڈیوں کو شہزادی صاحبہ بہ نظر انصاف دیکھیں اور کچھ غیرت کو بھی کام فرمائیں، یقین تو ہے چلو بھر پانی میں محجوب ہو کر ڈوب جائیں"۔
ماہ طلعت یہ سن کر سن ہوئی، سر جھکا لیا، جان عالم نے پنجرا اٹھا لیا، دیوان خانے میں لے جا مفصل حال دریافت کرنے لگا۔ ہر دم سرد بھرنے لگا۔

مولوی جامی :- نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد
در آید جلوۂ حسن از در گوش
زجاں آرام برباید زدل ہوش

زدیدن ہیچ اثر نے درمیانہ کند عاشق کسانرا غائبانہ

توتے کو شہزادے کی طرز گفتگو، رنگ رو، آنکھ کی تری، ہونٹھ کی خشکی، دل کی دھڑک کلیجے کی پھڑک سے، کہ یہ نشان عشق گمان خط سب ہیں، ثابت ہوا کہ شہزادے کا دل پرزے پرزے اور دماغ عقل سے خالی ہوا۔ خیال محال وصال انجمن آرا بھرا، سخت نادم و خجل ہوا دل سے کہا کم بخت زبان نے، حسن کے بیان نے غضب کیا، منتر کارگر ہوا۔ پڑھا جن سر پر چڑھا، حضرت عشق کا گزر ہوا۔ چاہا کہ بہ لطائف الحیل اس عزم بے جا سے باز رکھے۔ کہا " اے نادان دشمن جان یہ قصد لاحاصل ہے عمداً اس کوچہ میں پانو نہ دھر، اپنے خون سے ہاتھ نہ بھر، بقول مؤلف :

خدا کو مان نہ لے نام عاشقی کا سرور
کہ منفعت میں بھی اُس کے ہیں سو ضرر پیدا

بیان اس کا محال ہے مگر مختصر سا یہ حال ہے۔ عقل اس کام میں دور ہو جاتی ہے، وحشت نزدیک آتی ہے، لب خشک، چشم تر، چہرہ زرد، دل خون ہوتا ہے۔ بھوک پیاس مر جاتی ہے۔ خواب میں نیند نہیں آتی ہے۔ جانِ شیریں تلخ ہو، کلیجے میں درد آخر کو جنون ہوتا ہے۔ لختِ جگر کھاتا ہے، خونِ دل پیتا ہے، مر مر کے جیتا ہے۔ قسموں کے طعنوں سے سینہ فگار ہوتا ہے۔ لڑکوں کے پتھروں سے سر گلنار ہوتا ہے۔ دن کو ذلت و خواری، شب کو انتظار میں اختر شماری، بے قراری سے قرار، سب کی نظر میں ذلیل و خوار، جنگل میں جی لگتا ہے، بستی اُجاڑ معلوم ہوتی ہے۔ دربدر پھرنے میں دن تو کٹ جاتا ہے، تنہائی کی رات پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ دل جلتا ہے، دیدے سے دریا اُبلتا ہے شجرِ تمنا بے برگ و بار رہتا ہے، پھولتا ہے نہ پھلتا ہے۔ جوانی کا گھن پیری تک اُدھیڑ بن رہتی ہے۔ گونگا بہرا بن جاتا ہے، طبیعت سن رہتی ہے۔ ابھی پہلی بسم اللہ ہے۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہو، لب پر آہ ہے۔ دیکھا نہ بھالا ہے، سینے کے پار عشق کا بھالا ہے۔ آئینہ ہاتھ میں لے منہ تو دیکھو نقشہ کیا ہے۔ معشوق باوفا گوگردِ سرخ لال سپید سے نایاب سوا ہے۔ کہاں کہاں ملتا ہے، خاک میں ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے خواہاں ملتا ہے۔ یہ جو زمانہ میں مشہور با مہر و وفا ہیں بانیِ صد جور و جفا ہیں۔ عشق کم بخت بے پیر ہے، اور نوجوانی بھی ٹیڑھی کھیر ہے۔ سنا نہیں کوہکن نے جانِ شیریں کس تلخی سے کھوئی، یوسف کی چاہ میں زلیخا نے کیسے کنوئیں جھانکے، کیا کیا روئی۔ مجنوں کو اس دشت میں جنون ہوا لیلیٰ کا کیا بگڑا؟ پرویز کا اس کوچے میں خون ہوا شیریں نے کیا کیا افسوس تو یہ ہے کہ اتنا بھی کوئی نہ سمجھا۔ جامی:

غمِ چیزے رگِ جاں را خراشد کہ گاہے باشد و گاہے نباشد

ذلت اس کام میں عزت ہے، درد کا نام یہاں راحت ہے۔ دل اس کشمکش میں ٹوٹ جاتا ہے، رستم کا اس معرکہ میں جی چھوٹ جاتا ہے۔ اسفندیار سا روئیں تن ہو تو موم کی طرح پگھل کر بہہ جائے حسرت ہی حسرت رہ جائے۔ لوگوں نے ہزاروں رنج و صدمے اس کام میں اٹھائے، بعد خرابیِ بسیار بھی ناتجربہ کار کہلائے۔ لیکن یہ وہ برا

کام ہے کہ اس میں مشاق اور مبتدی کی رائے ایک سی ہے اس کا آغاز ہے نہ انجام ہے۔

مولف ع : مرض عشق میں کوئی دوست گرفتار نہ ہو
دوست تو دوست ہے دشمن کو یہ آزار نہ ہو

مسدس

کیا میں اس کافر بدکیش کا احوال کہوں یہی خوں خوار پیا کرتا ہے عاشق کا خوں
زار کر دیتا ہے انساں کو یہ اور زبوں رفتہ رفتہ یہی پہنچاتا ہے نوبت بہ جنوں
یہی خوں ریز تو خوں خوار ہے انسانوں کا
دین کھوتا یہی کافر ہے مسلمانوں کا

یہی کرتا ہے ہر اک شخص کو رسوا ظالم یہی کرتا ہے ہر اک چشم کو دریا ظالم
لوہ دکھلاتا ہے گاہے گہے صحرا ظالم کیا بتاؤں تمھیں کرتا ہے یہ کیا کیا ظالم
دربدر خاک بسر چاک گریباں کر کے
جان لیتا ہے وے بے سر و ساماں کر کے

یہی بانی تو زلیخا کی بھی تھا خواری کا یہی باعث دمن و نل کی ہوا یاری کا
یہی فرہاد کا حامی تھا تبرداری کا عشق کہیے نہ اسے قہر ہے یہ باری کا
تلخ کامی ہوئی شیریں کو اسی سے حاصل
کیے بے پردا و برباد ہزاروں محمل

اس نے مجنوں سے بنائے ہیں بہت دیوانے اس نے خود رفتگی میں اپنے کیے بیگانے
گو کہ مشہور جہاں اسکے ہیں سب افسانے پر جو اس کام کا مشاق ہو وہ ہی جانے
کبھی معشوق کے پردے میں نہاں ہوتا ہے
کبھی سر چڑھ کے یہ عاشق کے عیاں ہوتا ہے

ناقۂ لیلیٰ مضطر کا شتربان یہ تھا نجد میں قیس سے پہلے ہی حدی خواں یہ تھا
چاہ میں ڈال کے یوسف کا نگہباں یہ تھا جان بر شیر کی لینے کو نیستاں یہ تھا

حسن بن جاتا ہے انداز کہیں ناز کہیں
درد دل ہے یہ کہیں سوز کہیں ساز کہیں

مثل فرہاد بہت مرگئے سر پھوڑ حزیں
دی ہے شیریں کی طرح کتنوں نے جاں شیریں
پاس عذرا کے گیا اور کبھی وامق کے قریں
اس سے آوارہ بچا اور نہ بچا گوشہ نشین
اس سے ملتا ہے جسے رنج و محن ملتا ہے
گور ملتی ہے کسی کو نہ کفن ملتا ہے

طور کو نور کے جلوے میں جلایا اس نے
کبھی آتش کو ہے گلزار بنایا اس نے
جان چھوڑی نہیں جیتا جسے پایا اس نے
اور نیرنگ جہاں اپنا دکھایا اس نے
کام مردوں سے لیا زندوں کو ناکام رکھا
درد کا نام کبھی بے دردنے آرام رکھا

اس کے افسانے ہیں دنیا میں بہت طول طویل
جس کا ہمدم یہ ہوا ہوگیا وہ خوار و ذلیل
اس کا بیمار پڑا رہتا ہے بستر پہ علیل
دھونس دے دے کے بجا دیتا ہے یہ کوس رحیل
رنج و ماتم کے سوا اور یہ کیا دیتا ہے
وصل کی شب سحر ہجر دکھا دیتا ہے

یہی اخفا ہے بصد زیب رگ ہر گل میں
سوز و نالہ یہ اسی کا ہے دل بلبل میں
یہی ہے جزو میں گر دیکھو یہی ہے کل میں
گر فرشتہ ہو تو آجاتا ہے اس کے جل میں
خون بے جرم زمانے کا بہاتے دیکھا
میل چتون پہ کبھی اس کے نہ آتے دیکھا

ایک شمہ ہے لکھا حال جو میں نے اس کا
جس پہ اس دیو نے الطاف کا سایہ ڈالا
دشت غربت میں وہ آوارہ و سرگشتہ ہوا
دوست بھی چھوٹتے ہیں شہر کبھی چھوٹے اپنا
پاس جس کے یہ گیا خلق سے وہ دور ہوا
کونسا شیشۂ دل تھا کہ نہ وہ چور ہوا

ہجر کے رنج میں کتنوں کا ہوا اس میں وصال ۔۔۔ رہ گئے سینے میں فرقت کا سبھی درد و ملال
اس کی گردش سے ہر اک ماہ ہوا بدر ہلال ۔۔۔ کسکی طاقت ہے جو تحریر کرے اسکا حال

زیست کرنا غم ہجران سے ہے سب کو شاق
جان دیدیتے ہیں کہہ کہہ کے یہی ہائے فراق

وصل میں یہ مزا ہے، ہجر کا رنج وہ جانگزا ہے ۔ چاہ کنوئیں جھکواتی ہے ۔ یہ وہ بیماری ہے جو جان کے ساتھ جاتی ہے ۔ ہمیشہ سے اس کام والے آہ و نالہ برلب، خاک بسر، چاک گریباں سب رہے ہیں ۔ گر عاشق کی عزت و توقیر ہوتی تو دنیا میں اس سے بہتر کوئی شے نہ تھی ۔ کچھ کچھ ان لوگوں کے مرتبہ شناس قدر داں ہیں، مگر ہر جگہ کہاں ہیں اور یہ قصہ جو میں نے کہا فقط بات کی پچ کا جھگڑا تھا ۔ ورنہ کہاں ملکہ زرنگار کجا شہزادئ عالی تبار ۔ جان عالم نے کہا استغفراللہ اگر وہ جھوٹ تھا تو یہ فقرہ کب سچ ہے ۔ یہ تو نری گھڑ پچ ہے ۔ سوز :

خدا ہی کی قسم ناصح نہ مانوں گا کہا اب تو
نہ چھوڑے گا ترے کہنے سے میرا دل لگا اب تو

اسی تقریر میں یہ حال ہوا دل میں درد چہرہ زرد ہونے لگا ۔ لب پر آہ سرد گرفتار رنج و تعب، عشق کے آثار سب ظاہر ہوئے، ضبط کا پردہ درمیان سے اٹھا، شور فغاں سے اٹھا جنوں پیرامون عقل بے چارہ نو گرفتار سلسلہ محبت میں اسیر بقول میر ہو گیا، میر :

طبع نے اک جنوں کیا پیدا ۔۔۔ اشک نے رنگ خوں کیا پیدا
ہاتھ جانے لگا گریباں تک ۔۔۔ چاک کے پانو پھیلے داماں تک
بے قراری نے کیجے ادا آہ کی ۔۔۔ تاب و طاقت نے بے وفائی کی

توتا یہ حال دیکھ کر بہت محجوب ہوا کہ ناحق رنڈی کی کج بحثی سے شہزادے کو مرگ کا مستعد کیا ۔ بیٹھے بٹھائے خون بے گناہ اپنی گردن پر لیا ۔ اب اس طرح کا سمجھانا، مانع ہونا، ابھارنا بھڑکانا بلکہ نرا جلانا ہے گھبرا کر تسکین و تشفی کرنے لگا اور زخم شمشیر عشق کو مژدۂ وصال سے بھرنے لگا ۔ کہا کہ آپ ہوش و حواس بجا رکھیے ۔ اگر مجھا ایسا

سچا جانا کہ میرا جھوٹ سچ مانا، اس شرط سے آپ کو لے چلوں گا جو میرا کہا نہ مانو گے زک اٹھاؤ گے، دھوکا کھاؤ گے، پھر مجھ کو نہ پاؤ گے۔ جان عالم نے فرمایا" اے رہبر کامل رنج کے غمگسار، راحت کے شامل، تیرے جادۂ اطاعت سے ہرگز قدم باہر نہ دھروں گا۔ جو تو کہے گا وہی کروں گا۔ مگر جلد حال مفصل اور بعد منازل و سمت شہر دوست سے نشان کامل دے۔ وگرنہ یہ دل بے تاب، عجلت وہ بے قراری سیماب کہ قطرۂ خوں سے فروں نہیں، تڑپ کر از راہ چشم نادیدہ روئے دوست نکل جائے گا پھر بجز حسرت وافسوس تیرے کیا ہاتھ آئے گا۔ میر:

دل تڑپتا ہے متصل میرا مرغ بسمل ہے یا کہ دل میرا

توتے نے کہا اضطراب کا کام خراب ہوتا ہے۔ اتنی جلدی موقوف کیجیے۔ آج کی رات اس شہر میں کاٹ صبح ادھر کی راہ لیجیے۔ اگر کشش صادق اور طالع بھی موافق ہے انشاءاللہ منزل مقصود پر پہنچیں گے۔ عزم بالجزم درکار ہے اور شہر پناہ پر خانۂ یار ہے جان عالم یہ خوش خبری سن کر بشاش ہوا پھر کہا، استاد:

مژدۂ وصل ہے کل رات کی نیت ہو حرام

رے اگر طالع برگشتہ نہ تدبیر آلٹ

اس رات کی بے قراری، گریہ و زاری، اختر شماری شہزادے کی کیا کہوں ہر گھڑی بحال پریشان سوئے آسمان مضطر نگراں تھا کہ رات بسر ہو، جلد سحر ہو، اور یہ کہتا تھا

سعدی: سعدیا نوبت امشب دھل صبح نہ کوفت

یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

آخر تاثیر دعائے سحری و اثر نالۂ نیم شبی سے ظلمت شب پہ نور روز منور ہوئی وزیر زادے کو باوجود خود فراموشی یاد فرمایا۔ لڑکپن سے تا زمانہ عشق انجمن آرا اسی سے بھی الفت رکھتا تھا۔ جب وہ حاضر ہوا حکم کیا۔ دو گھوڑے صبا رفتار برق کردار جن کی جھپٹ نسیم تند رو کو کھنڈل ڈالے، ان کے قدم سے کمیت صرصر کی ڈپٹ پالو نہ آگے نکلے جلد لا۔ بمجرد ارشاد اصطبل خاص میں جا گھوڑے لایا۔ کچھ

اسباب ضروری بھی بمجبوری لے کے وہ دونوں خستہ تن بقول میرحسن چل نکلے ۔

میرحسن :
نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

تہذیب الاخلاق

(سر سید احمد خاں)

اُمید کی خوشی

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک! اے آسمان کے تارو! تمہاری خوش نما چمک، اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو! اے پہاڑ کے عالی شان درختو! اے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو!! تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتیوں اور بہاتی ہوئی نہروں سے کیوں زیادہ خوش نما معلوم ہوتے ہو۔ اس لیے کہ ہم سے بہت دور ہو اس دوری ہی نے تم کو یہ خوب صورتی بخشی ہے۔ اس دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے، تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے، وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے۔

وہ چیز کیا ہے؟ کیا عقل ہے جس کو سب، سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ کیا وہ ہم کو آئندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے۔ بڑی دوڑ دھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی ہے جو سب کے سامنے ہے او نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی خوب صورت بیٹی، اُمید! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں: تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لیے، نام آوری نام آوری کے لیے، بہادری بہادری کے لیے، فیاضی فیاضی کے لیے، محبت محبت کے لیے، نیکی نیکی کے لیے تیار ہے۔

انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرمانبردار ہیں۔

وہ پہلا انسان جب شیطان کے چنگل میں پھنسا اور تمام نیکیوں نے اس کو چھوڑا اور تمام بدلیوں نے اس کو گھیرا تو ہی نے اس ناامید کو ناامید ہونے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا تو ہی نے اس کو اس ذلت سے نکالا اور پھر اس کو اعلیٰ درجہ پر پہنچایا جہاں کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا تھا۔

اس نیک نبی کو جس نے سینکڑوں برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مار پیٹ سہی، تیرا ہی خوب صورت چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا ناخدا، جب کہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کو کھینے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔

تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔ زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہنچی۔ جو برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔

اے آسمانوں کی روشنی! اور اے ناامید دلوں کی تسلی "امید" تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل ملتا ہے۔ تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے۔ تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔ عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ، بہتی نہروں کی لہریں، اس کے دل کو راحت دیتی ہیں اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں۔ اور دور دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں۔

دیکھ! نادان بے بس بچہ گہوارے میں سوتا ہے۔ اس کی مصیبت زدہ ماں دھندے میں لگی ہوئی ہے۔ اور اس گہوارے کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے۔ اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔ "سو رہ میرے پیارے بچے سو رہ۔ اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سو رہ۔

اے میرے دل کی کونپل سورہ۔ بڑھ اور پھل پھول۔ تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پاوے۔ تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے۔ کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آوے۔ کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے سورہ' تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت' تیری لیاقت تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا آخر کار ہمارے دل کو تسلی دیں گے۔ تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اجالا ہوگی۔ تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور کریں گی۔ تیری آواز' ہمارے لیے خوش آیند راگنیاں ہوں گی۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ اے ہماری امیدوں کے پودے سورہ۔ لولو' جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جائیں گے تو تم کیا کرو گے؟ تم ہماری بے جان لاش کے پاس کھڑے ہوگے۔ تم پوچھے گے اور ہم کچھ نہ بولیں گے، تم روؤگے اور ہم کچھ رحم نہ کریں گے۔ اے میرے پیارے رونے والے تم ہمارے ڈھیر پر آکر ہماری روح کو خوش کروگے۔ آہ ہم نہ ہوں گے' اور تم ہماری یادگاری میں آنسو بہاؤگے۔ اپنی ماں کا محبت بھرا چہرہ' اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کروگے۔ آہ! ہم کو یہی رنج ہے' کہ اس وقت ہماری محبت یاد کر کر تم رنجیدہ ہوگے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ میرے بالے سورہ۔"

یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جب کہ بچہ غوں غوں بھی نہیں کر سکتا تھا' مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا' اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور "اماں! اماں!" کہنا سیکھا۔ اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی۔ آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا۔ پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا۔ رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا۔ اور جبکہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھوکر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح' کی نماز میں کھڑا ہونے لگا' اور اپنے بے گناہ دل' بے گناہ زبان' بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو امید کی خوشیاں

اور کس قدر زیادہ ہوگئیں ۔ اُس کے ماں باپ اُس معصوم پسر سے سچی ہمدردی دیکھ کر کیسے خوش ہوتے ہیں۔ اور ہماری پیاری امید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے ۔

دیکھو ! وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے اس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں سے غائب ہوگیا ہے ۔ وہ اس کو ڈھونڈتا ہے پر وہ نہیں ملتا ۔ مایوس ہے پر امید نہیں ٹوٹی ۔ بھوبھرا' دانتوں سے بھٹا کرتا دیکھتا ہے ۔ پر ملنے سے ناامید نہیں ہوتا ۔ فاقوں سے خشک ہے' غم سے زار و نزار ہے' روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئی ہیں ۔ کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے' مگر صرف امید ہے جس نے اس کو وصل کی امید میں زندہ اور اس خیال میں خوش رکھا ۔

دیکھو! وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنوئیں میں سات تہہ خانوں میں بند ہے ۔ اس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے ۔ بے یار و مددگار' غیر قوم' غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے ' بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے ۔ عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین رکھتی ہے ۔ قید خانہ کی مصیبت' اس کی تنہائی ' اس گھر کا اندھیرا' اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال' اس کو نہایت رنجیدہ رکھتا ہے ۔ اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے ۔ مگر اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید ! تجھی میں اس کی خوشی ہے ۔

وہ دلاور سپاہی' لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے ۔ کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے ۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے ۔ لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں ۔ اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے ' دلوں میں عجیب قسم کی خوف میں ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے ۔ اور لڑائی کے بگل کی آواز سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ بجلی

سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اُس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں، اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوت بازو اور اے بہادروں کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال اُن کے دلوں کو تقویت دیتا ہے، ان کا کان نقارے میں سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا پیاسا، اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ اُن کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے۔ مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے۔ انھیں کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند عزیز اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں:

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں مگر ہاں ہاں کر کر: محنت اور دل سوزی سے دور رہ کر، بہت سی ہمدردی کرتے ہیں پر کوٹھی کٹھلے سے الگ کر کر، دل ہر وقت بے قرار ہے کسی کو اپنا سا نہیں پاتا، کسی پر دل نہیں ٹھہرتا، مگر اے بے قرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے، تو ہی ہمارے دل کی تسلی ہے، تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے، تیری ہی تقویت سے ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچیں گے، تیرے ہی سبب گوہر مراد کو پاویں گے، اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے مہدی کی پیاری "امید" تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید، جب کہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لب بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی۔ رنگ فق ہو جاتا

منہ پر مردنی چھاتی ہے، ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں، ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔

اس وقت زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرا دکھائی دیتا ہے۔ تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب ہمارے لئے موسم بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہوجاتا ہے۔ اس لازوال آنے والی خوشی کی امید تمام دنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے اور غم کی شام کو خوشی کی صبح سے بدل دیتی ہے، گو کہ موت ہر وقت جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوفناک چیز ہے۔

اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہنچتی۔ تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے۔ ایمان کے توشہ اور امید کے ہادی اور موت کی سواری سے۔ مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے جس کا پیارا نام "امید" ہے

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے، وہ اپنے اس بے تکلف ہونے والے زمانے کی امید میں نہایت بردباری سے اور رنجوں کے زمانے کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے۔

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

اردوئے معلیٰ

(اسد اللہ خاں غالب)

رقعاتِ غالب

بنام میر مہدی حسین صاحب مجروح

جویائے حال دہلی و الو سلام لو۔ مسجد جامع واگزاشت ہوگئی چتلی قبر کی سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے، مرزا الٰہی بخش، مولوی صدرالدین، تفضل حسین خاں تین یہ، سات اور۔ ۷ نومبر ۱۲ جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ وقید جسم سے رہا ہوئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو نری انگیٹھی پر گزارا ہے۔ بوتل گلاس موقوف۔ راجہ پٹیالہ مرگیا۔ مہندر سنگھ اس کے خلف پر خطاب فرزندی اور القاب بحال و برقرار رہا۔ بالفعل دیوان نہال چند کام کر رہا ہے۔ ظاہرا جو رنگ اس ریاست کا ہونے والا ہے۔ وہ نواب گورنر جنرل بہادر کے آنے پر کھلے گا اور وہ فروری کے مہینے میں یہاں آئیں گے، الور کی ریاست کا حال بدستور ہے۔ گورنر صاحب ہی انہیں اختیار دیں گے۔ یعنی پٹیالہ اور الور کے راج کا انتظام اسی وقت پر ہوگا۔ بالفعل اسپی صاحب ریجنٹ الور ادر دلی ہوتے ہوئے میرٹھ گئے ہیں۔ راجہ صاحب تجارہ تک ان کی مشایعت کو گئے۔ یہاں اسپی صاحب سے کوئی صاحب سنگھ ٹھیکہ دار الور کی سڑک کا ہے۔ اس نے کچھ کہا تھا۔ جواب دیا کہ الور کے مقدمات میں

پنسچوں کو اختیار ہے ہم کچھ حکم نہ دیں گے۔ اسفند یار بیگ متوفی کا کوئی متبنی مستدعی پرورش ہوا، اس کو بھی یہی جواب ملا۔ اب بولو کیا لکھوں۔ دھوپ میں بیٹھا ہوں یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر بند کر کر آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے، اس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔ بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا۔ باہر آؤں گا پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا، کیا صحبت ہوگی مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب اور ذاکر الحسین میر افضل علی عرف میرن صاحب کو دعا، منگل کا دن جمادی الثانی ۱۲ دسمبر پہر دن چڑھے غالب۔

(۲)

آؤ میاں سیدزادۂ آزادہ، دلی کے عاشق دلدادہ۔ ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنو کو برا کہنے والے، دل میں نہ مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن کہاں ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب بے خود و مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی وائے دلی۔ بھاڑ میں جائے دلی۔ سنو صاحب پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خان ولد دلاور خاں اور نانا اس احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں ولد مصاحب خاں۔ اس شخص کا حال از روے تحقیق مشرح مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے، عمر کیا ہے، احمد حسین خاں کی لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے۔ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے۔ بھائی لکھ اور جلدی لکھ۔

(۳)

سید۔ خدا کی پناہ عبارت لکھنے کا ڈھنگ کیا ہاتھ آیا ہے کہ تم نے سارے جہاں کو ٹھگا ہے۔ ایک غریب سید مظلوم کے چہرۂ نورانی پر مہاسا نکلا ہے تم کو سرمایۂ

آرائش گفتار بہم پہنچایا ہے۔ میری دعا ان کو پہنچاؤ اور اُن کی خیر و عافیت جلد لکھو۔ بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے، سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے۔ آج ۲۷ مارچ کی ہے۔ پانچ چار دن مہینے میں باقی ہیں۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔ مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک دستنبو نواب لیفٹننٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لیفٹننٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بسبیل ڈاک آیا، وہی کاغذ افشانی وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔ پنشن کے ملنے کا حکم آج کل میں آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے یہاں سے کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔ میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ سرفراز حسین اور نصیر الدین کو دعا کہہ دینا اور یہ خط دکھا دینا۔

(۴)

بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں۔ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار جامع مسجد کا۔ ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اُترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیر دار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا، جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں، جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ، ولوہارو و تحت حکومت ہانسی حصار پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے کمشنر صاحب بہادر ان دونوں

کو یہاں لے آئے تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس ۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود ۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں ۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم اسد تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم ۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

تم آتے ہو چلے آؤ ۔ جان نثار خاں کے چھتے کی، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا سن جاؤ ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ ۔ چلے جاؤ ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا، حکیم الملک حکیم مرزا اشرف علی کو دعا ۔ قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا، یوسف ہند میر افضل علی کو دعا ۔ غالب ۔

(۵)

جان غالب تمہارا خط پہنچا ۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے ۔ ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے ۔ مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا ۔ اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی ۔ میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے ۔ ارے اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں ۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے ؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں ۔ خس کی ٹٹی، پروا ہوا اب کہاں، وہ لطف تو اسی مکان میں تھا ۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے بہر حال می گزرد ۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا ۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے ۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے ۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا ۔ جامع مسجد میں راج گھاٹ دروازے تک

بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا امکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا، اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے اعتقاد ارے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں، دلی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔ اور الور کا حال کچھ اور ہے مجھے اور انقلاب سے کیا کام۔ الیگزینڈر ہدرلی کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا ان کی مصاحبت نہیں ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

بنام عضدالدولہ حکیم غلام نجف خاں صاحب

بھائی میرا ذکر سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور ہے ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دولت تنہائی میسر آجاتی لیکن اس تنہائی چند روزہ اور تجرید مستعار کی کیا خوشی۔ خدا نے لاولد رکھا تھا شکر بجا لاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے۔ یعنی جس لوہے کا طوق اسی لوہے کی دو ہتکڑیاں بھی پڑ گئیں۔ خیر اس کا کیا رونا ہے یہ قید جاودانی ہے۔ جناب حکیم صاحب ایک روز از راہ عنایت یہاں آئے۔ کیا کہوں کہ ان کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے۔ خدا ان کو زندہ رکھے

میاں میں کثیر الاحباب شخص ہوں ۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے ۔ خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو شاید میرا کوئی جاننے والا نہ بچے گا۔ اس راہ سے مجھ کو جو دوست اب باقی ہیں بہت عزیز ہیں ۔ واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے ۔ کیا معنی کہ جو میں مروں کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔ مصطفی خاں کا حال سنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں ۔ احمد حسین مے کشن کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں ۔ مخنوق ہوا ۔ گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں ۔ پنشن کی درخواست دے رکھی ہے ۔ بشرط اجرا بھی میرا کیا گزارہ ہو گا ۔ ہاں دو باتیں ہیں کہ موافق قول عوام چولہے دلدر نہ ہو گا ۔ تجھ کو میری جان کی قسم اگر میں تنہا ہوتا تو اس وجہ قلیل میں کیا فارغ البال اور خوش حال رہتا ۔ یہ بھی خبط ہے جو میں کہہ رہا ہوں ۔ خدا جانے پنشن جاری ہو گا یا نہ ہو گا ۔ احتمال تعیش و تنعم بشرط تجرید صوت اجرائے پنشن میں سوچتا ہوں اور وہ موہوم ہے ۔ بیدل کا شعر مجھ کو مزہ دیتا ہے ۔

نہ شام ما را سحر نویدی نہ صبح ما را دم سپیدی
چو حاصل ماست نا امیدی غبار دنیا بفرق عقبیٰ

اس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا ۔ جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا ۔ زیادہ کیا لکھوں
از غالب ۔

توبتہ النصوح

(مولوی نذیر احمد)

*

مرزا ظاہر دار بیگ

وہ گھر سے نکل کر ایسا بے تکلف مرزا ظاہر دار بیگ کی طرف مڑا جیسے مطلق العنان گھوڑا تھان کی طرف رخ کرتا ہے۔ مرزا ظاہر دار بیگ کی ظاہر داری نے اس کو اس قدر دھوکا دے رکھا تھا کہ وہ ان کو ماں باپ بھائی بہن خویش و اقارب سب سے بڑھ کر اپنا خیر خواہ، سب سے زیادہ اپنا دوست سمجھتا تھا اور بے امتحان بے آزمائش اس کو مرزا پر ایسا تکیہ و اعتماد تھا کہ اتنا شاید دانشمند آدمی کو متواتر تجربوں کے بعد کسی دوست پر بھی نہیں ہو سکتا۔

بات اصل یہ ہے کہ مردم شناسی جو ایک صفت ہے کلیم میں مطلق نہ تھی۔ مرزا سے زیادہ اس کو اپنی نسبت مغالطہ تھا اور اس نے اپنے تئیں ایسا عزیز الوجود فرض کر رکھا تھا کہ ایک سے ایک لایق نوکری کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی اور کلیم کے ذہن میں از خود یہ خناس سمایا ہوا تھا کہ گویا تمام ہندوستانی سرکاریں اس کے قدوم میمنت لزوم کی متمنی اور منتظر ہیں اور جس طرف کو چل کھڑا ہو گا وہاں کا والی ملک اس کی تشریف آوری کو غنیمت سمجھے گا۔

گھر سے نکلا تو محض تہی دست لیکن اس خیال میں مگن کہ اب کوئی دم جاتا ہے کہ مالک خزائن الارض بننے والا ہوں۔ چلا جوتیاں چٹخاتا ہوا مگر اس تصور میں مست کہ نیل کوہ پیکر مع ہودج زر اس کی سواری کے لئے آ رہا ہے۔ باوجودے کہ شب خوابی کے کپڑوں کے سوائے بدن پر کچھ نہ تھا، تاہم خلعت ہفت پارچہ

کی امید میں :

نظر اس کی نخوت کے زینے پہ تھی
کہ شانوں سے اتری تو سینے پہ تھی

قصہ کوتاہ کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی، لیکن مرزا جیسے نکھٹے بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد۔

اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا، وہ بھی حقیقی نہیں، ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار، دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار، تیسرے ان دلوں کی بے عنوانی، اس پر خود اس کی رشوت ستانی، بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد دلی کے روداروں میں ہوگیا مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے باوجودے کہ دور کی قرابت تھی۔ حسبۃً للہ اس کا تکفل اپنے ذمہ لیا۔ جمعدار اپنی حیات میں اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے پوتے اور نواسے کثرت سے تھے انھوں نے بے اعتنائی کی۔ اگرچہ جمعدار بہت وصیت کر مرے تھے مگر ان کے ورثا نے بہ ہزار دقت محلسرا کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا اور سات روپے مہینے کے کرایہ کی دکانیں مرزا کے نام کرا دیں۔ یہ تو حال تھا۔ اس پر مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی، تین آدمی اور سات روپے کی کل کائنات، اس پر مرزا کی شیخی و نمود۔ یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے جن کو صدہا روپے ماہ وار کی مستقل آمدنی تھی۔

اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے، مگر یہ بے غیرت زبردستی ان

میں گھستا تھا۔ کسی کو ماموں جان، کسی کو بھائی جان کسی کو خالو جان بتاتا اور وہ لوگ اس کے ادعائے رشتہ ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیر زادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں۔ مگر امیر زادگی نہ تھی تو کیسے نبھے دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہترا بکتی مگر کون سنتا تھا۔

مرزا کو جب دیکھو پانو میں ڈیڑھ حاشیہ کی جوتی، سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے اوپر شبنم یا ہلکی تن زیب، نیچے کوئی طرح دار ساڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہو تو بانات مگر سات سات روپے گز سے کم نہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام، اور تیسرے پہر کاشانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی، سرخ نیفہ۔ پائجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے اور تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا۔ ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا۔ اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔

غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ اب چند روز سے دونو میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح تو بلا ناغہ آتے اور تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا ہے اور وہ جمعدار کی محل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا۔

اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔

بار بار پکارنے اور کنڈی کے کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے پوچھا "کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے ؟"۔

کلیم ۔ جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی ۔ کون مرزا ؟

کلیم ۔ مرزا ظاہر دار بیگ جن کا یہ مکان ہے ۔ اور کون مرزا ؟

لونڈی ۔ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ مرزا نہیں ہے ۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرے، کہ کلیم نے کہا کہ کیوں جی کیا یہ جمعدار کی محل سرا نہیں ہے ؟

لونڈی ۔ کیوں نہیں ؟

کلیم ۔ پھر تم نے کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ؟ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں ۔

لونڈی ۔ جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے ۔ موا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے ؟

دوسری لونڈی ۔ اری کم بخت یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں ۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے ۔ (کلیم سے مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ نا، جن کی رنگت زرد زرد ہے آنکھیں کرنجی چھوٹا قد، دبلا ڈیل، اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں ۔

کلیم ۔ ہاں ہاں وہی ظاہر دار بیگ ۔

لونڈی ۔ تو میاں اس مکان کے پچھواڑے اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے وہ اس میں رہتے ہیں ۔

کلیم نے وہاں جاکر آواز دی تو کچھ دیر کے بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگیہ پہنے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے۔

مرزا۔ آہا آپ ہیں؟ معاف کیجئے گا۔ میں نے سمجھا کوئی اور صاحب ہیں بندہ کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہمرکاب چلوں۔

کلیم ۔ چلئے گا کہاں؟ میں تو آپ کے پاس آیا تھا۔

مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردا کرا دوں

کلیم ۔ میں آج شب کو آپ ہی کے ہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا۔ بسم اللہ تو چلیے اس مسجد میں تشریف رکھیئے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے، وہ بھی مسجد ضرار کی طرح ویران۔ وحشت ناک نہ کوئی حافظ نہ ملا، نہ طالب علم، نہ مسافر؛ ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں۔ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہوئی ہے کہ بجائے خود کھر نجے کا فرش بن گیا ہے۔

مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اُسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدر فرمانے لگے کہ۔

مرزا ۔ بندہ کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا۔ اسی وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے یہ فرمایئے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار تمام

ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا - پھر کیا ارادہ ہے؟

کلیم - سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا - خیر نیت شب حرام - صبح تو ہو - آپ بے تکلف استراحت فرمایئے میں جاکر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں۔ اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم - یہ کیا ماجرا ہے - تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوھری محل سرائیں، متعدد دیوان خانے، کئی پائیں باغ ہیں - حوض اور حمام اور کٹڑے، گنج، دکانیں اور سرائیں ہیں - میں تو جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو یا یہ حال ہے ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لیے تم کو جگہ میسر نہیں - لیکن جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کیے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جمعدار کے تمام ترکہ پر تم قابض اور متصرف ہو۔ لیکن میں اس تمام جاہ وحشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا - آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا - یہ اختلاف حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی وجہ ہے بندہ کو جمعدار صاحب مرحوم مغفور نے متبنیٰ کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے رخنہ اندازیاں کیں - بندہ کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں دور بھاگتا ہے صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منائے جائیں۔

کلیم۔ لیکن آپ نے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا ۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت و حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو ٹھہرے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے ۔ اجازت دیجیے کہ میں جا کر بچھونا بھجوا دوں اور مریضہ کی تیمار داری کروں۔

کلیم ۔ خیر مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجیے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے ۔

مرزا۔ چراغ کیا میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن گرمی کے دن ہیں، پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہوجیئے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے، روشنی دیکھ کر گرنی شروع ہوں گی ۔ تھوڑی دیر صبر کیجیے کہ مہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروانہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا۔ کیونکہ اول تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ دوسرے یہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس سے متعرض نہ ہوا اور کلیم بے چارے کا بھوک کے مارے یہ حال مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔

جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ :

کلیم ۔ سنو یار میں نے تو کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا ۔ سچ کہو ۔ نہیں جھوٹ بہکاتے ہو ۔

کلیم ۔ تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں ۔

مرزا ۔ مرد خدا ! تو آتے ہی کیوں نہیں کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے ؟ دکانیں سب بند ہوگئیں اور جو دو ایک کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی ۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے گھر میں تو آج آگ تک نہیں سلگی، مگر ظاہرا تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے ۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے ۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرم گرم چنے کی دال بنوا لاؤں ۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو اور تم کو دونوں کو کافی ہوگی ۔ رات کا وقت ہے ۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے مگر دھیلے کے کہہ گئے تھے یا تو کم لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے ۔

مرزا ۔ یار ! ہو تو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا ۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ ۔ دیکھو تو کیسے جھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوش بو بھی عجب ہی دل فریب ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا ۔

تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا ۔ کوئی فن ہو، کمال بھی کیا چیز ہے ؟ دیکھیے ! اتنی تو رات گئی ہے مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے ۔ بندہ نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھیے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے اور بھئی تمہیں میرے سر کی قسم سچ کہنا ایسے خوب صورت، خوش قطع، سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے ۔

دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں

ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور اور دالوں کا رنگ دیکھیے کوئی بسنتی ہے اور کوئی پستئی۔ غرض دونوں رنگ خوش نما۔ یوں صدہا قسم کے غلے اور پھل زمین سے آگئے ہیں لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سنی ہے

کلیم۔ فرمائیے۔

مرزا۔ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو ارزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد کر گیا کہ یا حضرت! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے۔ کہ جہاں میں نے سرزمین سے نکالا تیر ستم چلنے لگا۔ ماکولات میں اور بھی ہیں۔ مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی اور پر نہیں ہوتے۔ نشوونما کے ساتھ تو میری قطع وبرید ہونے لگتی ہے۔ میری کوپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے ہیں۔ اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں۔ جب بارور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکری بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ھولے کرنے شروع کیے۔ پکا تو شاخ وبرگ بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ اس کو دلیں، گھوڑوں کو کھلائیں، بھاڑ میں بھونیں، بیسن بنائیں کھولتے ہوئے پانی میں ابالیں۔ گھنگھنیاں پسائیں، غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اس طرح بے باکانہ چٹر پٹر بولنا سن کر حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اسے کھانے کو دوڑا۔ چنا یہ ماجرا دیکھ بے انتظار حکم اخیر رخصت ہوا۔

سو حضرت! یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا ورنہ میر مدو کے کبابوں میں یہ خستگی اور سوندھاپن کہاں؟" غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی اس کو ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزیدار معلوم ہوے۔ مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔

دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہونا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خلوت خانے اور عشرت منزل میں رہتا تھا یا اب ایک مسجد میں آکر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا تھوڑا سا حال ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوان نعمت کو لات مار کر نکلا تھا۔ تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس نہ غمخوار، نہ نوکر نہ خدمت گار۔ مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا۔ جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار، یا قفس میں مرغ نو گرفتار۔ اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبہ پکڑتا، اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجردم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوجھنے کو تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں کہی۔ صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا کوئی عیار ٹوپی، جوتی، رومال، چھڑی، تکیہ دری یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی لے کر چنپت ہوا۔

یوں بھی کلیم بہت دیر سے سو کے اٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا، تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد پر پڑا ہے اور نیند کے خمار میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبھوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلب ماہیت ہو کر بھتنا تو نہیں ہو گیا۔ مرزا کو ادھر ادھر دیکھا کہیں پتہ نہیں۔ مسجد تھی ویران اس میں پانی کہاں صبر کر کے بیٹھا رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو نکلے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔ اس میں دوپہر ہونے کو آئی۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا جوں ہی زینہ پر چڑھا کہ کلیم اس سے عرض کرنے کے لیے لپکا۔ وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے اس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہترا پکارا، اس لڑکے نے پیٹھ پھیر

کر نہ دیکھا۔

ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو الو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سیدھا مرزا کے مکان پر گیا آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کرکے ممکن ہو تو منھ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی۔ تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے یہ سوچ کر اس نے کہا۔

کلیم۔ کیوں حضرت! آپ مجھ سے واقف ہیں۔ اندر سے آواز آئی۔ ہم تمہاری آواز تو نہیں پہچانتے اپنا نام و نشاں بتاؤ تو معلوم ہو۔

کلیم۔ میرا نام کلیم ہے اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب کی وجہ سے مسجد میں تھا۔

گھر والے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے۔ جو رات کو تمہارے سونے کے لیے بھیجا گیا تھا؟

دری تکیہ کا نام سن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا کہ اندر سے آواز آئی۔

مرزا زبردست بیگ! دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے دوڑ کر تکیہ اور دری تو اس سے لے لو۔

کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے چور چور کرکے جا لیا۔ ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کیے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

مقدمہ شعر و شاعری

(مولوی الطاف حسین حالی)

شعر کی ماہیت

شعر کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں مگر کوئی تعریف ایسی نہیں جو اس کے تمام افراد کو جامع اور مانع ہو دخول غیر سے۔ البتہ لارڈ مکالے نے جو کچھ شعر کی نسبت لکھا ہے گو اس کو شعر کی تعریف نہیں کہا جا سکتا لیکن جو کچھ شعر سے آج کل مراد لی جاتی ہے اس کے قریب قریب ذہن کو پہنچا دیتا ہے وہ کہتے ہیں کہ :۔

• شاعری (جیسا کہ دو ہزار برس پہلے کہا گیا تھا) ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبار سے مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے۔ مگر مصور، بت تراش اور ناٹک کرنے والے کی نقل شاعر کی نسبت کسی قدر کامل تر ہوتی ہے۔ شاعر کی کل کس چیز کی بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے پرزوں سے۔ اور الفاظ ایسی چیز ہیں کہ اگر ہومر اور ڈینٹی جیسے صناع بھی ان کو استعمال کریں تو بھی سامعین کے متنخیلہ میں اشیائے خارجی کا ایسا صحیح اور ٹھیک نقشہ نہیں اتار سکتے جیسا کہ موقلم اور چھینی کے کام دیکھ کر ہمارے خیال میں اترتا ہے۔ لیکن شاعری کا میدان وسیع اس قدر ہے کہ بت تراشی، مصوری اور ناٹک یہ تینوں فن اس کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے۔ بت تراش فقط صورت کی نقل اتار سکتا ہے۔ مصور صورت کے ساتھ رنگ کو بھی جھلکا دیتا ہے۔ اور ناٹک کرنے والا بشرطیکہ شاعر نے اس کے لیے الفاظ مہیا کر دیے ہوں صورت اور رنگ کے ساتھ حرکت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر شاعری باوجود اس کے کہ اشیائے خارجی کی نقل میں تینوں فنوں کا کام دے سکتی ہے۔ اس کو تینوں سے اس بات

میں فوقیت ہے کہ انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے۔ نہ وہاں مصوری کی رسائی ہے نہ بت تراشی کی اور نہ ناٹک کی۔ مصور اور ناٹک وغیرہ انسان کے خصائل یا جذبات اس قدر ظاہر کر سکتے ہیں جس قدر کہ چہرے یا رنگ اور حرکت سے ظاہر ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہمیشہ ادھورے اور نظر فریب نمونے ان کیفیات کے ہوتے ہیں جو فی الواقع انسان کے بطون میں موجود ہیں۔ مگر نفس انسانی کی باریک گہری اور بوقلموں کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعہ سے ظاہر ہو سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی و ذہنی کا نقشہ اتار سکتی ہے۔ عالم محسوسات دولت کے انقلابات، سیرت انسانی معاشرت نوع انسانی، تمام چیزیں جو فی الحقیقۃ موجود ہیں اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اشیا کے اجزا کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جاسکتا ہے، شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اسی قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلمرو"۔

ایک اور محقق نے شعر کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اس لیے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے، خواہ نظم میں ہو خواہ نثر میں"۔

مذکورہ بالا تقریروں کا مطلب زیادہ دل نشین کرنے کے لیے ہم اس مقام پر چند مثالیں ذکر کرنی مناسب سمجھتے ہیں۔

(۱) فردوسی کہتا ہے:

بمالید چاچی کماں را بدست — بہ چرم گوزن اندر آورد شست

ستوں کرد چپ را و خم کرد راست — خروش از خم چرخ چاچی بخاست

ان دونوں شعروں میں رستم کی وہ حالت دکھائی گئی ہے جب کہ وہ اشکبوس کشانی سے لڑنے کے لیے پیادہ میدان کارزار میں گیا ہے اور اس پر وار کرنے کے لیے کمان میں تیر جوڑا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان شعروں کے مضمون کو اگر ایک غیر شاعر معمولی طور پر

بیان کرتا تو صرف اس قدر کہنا کافی تھا کہ رستم نے کمان کے چلہ میں تیر جوڑا۔ لیکن اس بیان میں اس حالت کی (جب کہ وہ تیر چلانے کے لیے کمان تانے کھڑا تھا)، نقل مطلق نہیں پائی جاتی۔ البتہ جو اسلوب فردوسی نے اس کے بیان میں اختیار کیا ہے اس میں جہاں تک کہ الفاظ مساعدت کر سکتے تھے اس حالت کی کافی طور پر نقل اتاری گئی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک ایسی حالت ہے۔ جو آنکھ سے محسوس ہو سکتی ہے۔ اُس لیے اس کو ایک بت تراش یا مصور فردوسی کی نسبت زیادہ واضح اور زیادہ نمودار صورت میں ظاہر کر سکتا ہے۔

(۲) سعدی شیرازی:

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس شعر میں دمشق کے کسی قحط کا وہ عالم بیان کیا ہے جو وہاں کے باشندوں پر طاری تھا۔ اس مضمون کو ایک غیر شاعر اس سے زیادہ بیان نہیں کر سکتا کہ خلقت بھوکی پیاسی مر رہی تھی یا اناج اور پانی نایاب تھا یا اور اسی قسم کی معمولی باتیں جو قحط کے زمانے میں عموماً پیش آتی ہیں۔ لیکن منتہائے سختی قحط کی تصویر جن لفظوں میں کہ سعدی نے کھینچی ہے۔ ایسے معمولی بیانات سے ہرگز نہیں کھینچ سکتی اور چونکہ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو محسوس نہیں ہو سکتی اس لیے شاعر کے سوا مصور اور بت تراش دونوں اس کی نقل اتارنے سے عاجز ہیں۔ البتہ ایکٹر ایسا تماشا دکھانے میں کسی قدر عہدہ برآ ہو سکتا ہے بہ شرطے کہ شاعر نے اس کے لیے کافی الفاظ مہیا کر دیے ہوں۔

(۳) ابن دراج اندلسی ایک قصیدے میں اپنے شیر خوار بچے کی وہ حالت جب کہ وہ خود گھر والوں سے رخصت ہو کر کہیں دور جانے والا ہے اور بچہ اس کے منہ کو تک رہا ہے، بیان کرتا ہے:

عیی بمرجوع الخطاب ولحظہ، بموقع اھواء النفوس خبیر،

یعنی وہ بات کا جواب دینے سے تو عاجز ہے مگر اس کی آنکھ ان اداؤں سے واقف ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

اس شعر میں استاد نے ایک محض وجدانی کیفیت کی تصویر کھینچی ہے جس کی محاکات زمانۂ حال کے مصور، بت تراش اور ایکٹر بھی بلاشبہ کسی قدر کر سکتے ہیں لیکن نہ ایسی جیسی کہ شاعر نے کی ہے۔ نیز شاعر کے سوا کسی کو یہ اسلوب بیان ہرگز نہیں سوجھ سکتا۔ کیوں کہ جس مطلب کو اس نے اس پیرائے میں بیان کیا ہے اس کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ رخصت ہوتے وقت جو وہ میری طرف دیکھتا تھا اس پر بے اختیار پیار آتا تھا۔ اس معمولی بات کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے کہ وہ شیر خوار بچہ جس کے منہ میں بول تک نہ تھا اس کی آنکھ ایک ایسے بھید سے واقف تھی جس سے اکثر بڑے بڑے عاقل اور دانشمند واقف نہیں ہوتے یعنی یہ کہ کس طرح اوروں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

(ب) نظیری نیشاپوری:

نہ زیر شاخ گل، افعی گزیدہ بلبل را
نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

فصل بہار میں پھولوں کے کھلنے یا ہوا میں اعتدال پیدا ہونے یا بدن میں دوران خون کے تیز ہونے سے جو نشاط اور امنگ بلبل کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور جس کو شعرا گل و گلشن کے عشق سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کے جوش اور دلولے میں وہ دن بھر چہکتا رہتا ہے اس حالت اور کیفیت کو شاعر نے سانپ کے کاٹے کی لہر سے تعبیر کیا ہے۔ گو یہ تمثیل بھی اس حالت کی اصل حقیقت ظاہر کرنے سے قاصر ہے مگر جس قدر کہ اس حالت کا تصور ان لفظوں کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے اتنا بھی تصویر یا ناٹک کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ گویا اس کیفیت کا ظاہر کرنا مصوری، بت تراشی اور ناٹک کی دسترس سے باہر ہے۔ امید ہے کہ ان مثالوں سے شاعر اور غیر شاعر کے کلام میں نیز شعر اور مصوری میں جو فرق ہے وہ بخوبی ظاہر ہو گیا ہو گا۔

○

نیرنگِ خیال

(محمد حسین آزاد)

شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار

اے ملک فنا کے رہنے والو! دیکھو، اس دربار میں تمہارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں۔ بہت سے حب الوطن کے شہید ہیں جنھوں نے اپنے ملک کے نام پر میدان جنگ میں جاکر خونی خلعت پہنے، اکثر مصنف اور شاعر ہیں جنھیں اسی ہاتف غیبی کا خطاب زیبا ہے۔ جس کے الہام سے وہ مطالب غیبی ادا کرتے رہے اور بے غمی سے زندگی بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں جو بزم تحقیق کے صدر اور اپنے عہد کے باعث فخر رہے۔ بہت سے نیک بخت نیکی کے رستے بتاتے رہے جس سے ملک فنا میں بقا کی عمارت بناتے رہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لیے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالم یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں، حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا ثواب آخرت کے لیے یا دنیا کی نام وری اور شہرت کے لیے ہوئے، لیکن میں اس دربار میں انہی لوگوں کو لاؤں گا۔ جنھوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور نام وری کو سمجھا اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں۔ مگر بڑا انکر یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں ان کی حق تلفی نہ ہو جائے

کیوں کہ جن بچاروں نے ساری جاں فشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا ان کے حصے میں کسی طرح کا نقصان ڈالنا سخت ستم ہے۔ اسی لحاظ سے مجھے تمام مصنفین اور مورخین سے مدد مانگنی پڑی۔ چنانچہ اکثروں کا نہایت احسان مند ہوں کہ انھوں نے ایسے ایسے لوگوں کی ایک فہرست بنا کر عنایت کی اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اسی کے مقابلے میں گزری۔ نام وران موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے کہ انھوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اس عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا چوں کہ بیان اس کا لطف سے خالی نہیں اس لیے عرض کرتا ہوں۔

خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے ایک میدان وسیع الفضا[1] میں جا نکلا ہوں۔ جس کی وسعت اور دل فزائی میدان خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ انھیں محاسب فکر شمار کر سکتا ہے نہ قلم تحریر فہرست تیار کر سکتا ہے۔ اور جو لوگ اس میں جمع ہیں وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اور وہاں ایک پہاڑ ہے، جس کی چوٹی گوش سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھو ایسے سر پھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پانو نہیں جمنے دیتے ہاں حضرت انسان کے ناخن تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں۔

میرے دوستو! اس راستے کی دشواریوں کو سر پھوڑ اور سینہ توڑ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کرے تو ان بلاؤں کو جھیلے جن پر وہ مصیبتیں گزریں وہی جانیں

یکایک قلۂ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دل کش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی

---

[1] ۔ اس میدان کو میدان دنیا سمجھ لو۔

جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے بھی بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اتنے انبوہ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص تھے جن کے کان اس کے سننے کی قابلیت یا اس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے۔

ایک ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا اور وہ تعجب فوراً ہی جاتا بھی رہا، یعنی دوسری طرف نظر جا پڑی تو دیکھتا ہوں کہ کچھ خوب صورت عورتیں ہیں اور بہت سے لوگ ان کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں مگر یہ بھی وہیں چرچا سنا کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں نہ پری زاد عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں غفلت، کوئی عیاشی ہے۔ کوئی خوش پسندی، کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی ہمت والا ترقی کے رستے میں سفر کرتا ہے تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انہی میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان پر درختوں کے جھنڈ سایہ کیے تھے۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے گوناگوں میوے جھوم رہے تھے۔ طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ نیچے قدرتی نہریں اوپر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہیں وہ دانش فریب پریاں پتھروں کی سلوں پر پانی میں پانو لٹکائے بیٹھی تھیں اور آپس میں چھینٹے لڑ رہی تھیں مگر ایسے ایسے الجھاوے بلندیٔ کوہ کے ادھر ہی ادھر تھے۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں وہ اگرچہ اقوام مختلفہ اور عہدہائے متفرقہ، عمرہائے متفاوتہ رکھتے ہیں مگر وہی ہیں جو حوصلہ کے چھوٹے، ہمت کے ہیٹے اور طبیعت کے پست ہیں۔

دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ، صاحب ہمت، عالی طبیعت تھے وہ ان سے الگ ہو گئے اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندیٔ کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر لوگ آگے بڑھتے تھے اسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آئند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادہ سے آگے بڑھے کہ بلندیٔ کوہ پر چڑھ جائیں اور جس طرح ہو سکے

پاس جاکر اس نغمۂ آسمانی سے قوت روحانی حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے ساتھ لینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستے کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا کسی کے ایک ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی، ایک ہاتھ میں نشان تھا۔ کسی کے ہاتھ میں کاغذوں کے اجزا تھے۔ کسی کی بغل میں ایک کمپاس تھی۔ کوئی پنسلیں لئے تھا۔ کوئی جہازی قطب نما اور دوربین سنبھالے تھا۔ بعضوں کے سر پر تاج شاہی دھرا تھا۔ بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ تھا۔ غرضکہ علم ریاضی اور جر ثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا جو اس وقت کام نہ آ رہا ہو۔ اسی عالم میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتۂ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ سرگرمی اور گرم جوشی تمہاری ہمیں نہایت پسند ہے۔ اس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب منہ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اس کے گروہ مذکور فرقہ فرقہ میں تقسیم ہو گیا۔ کوہ مذکور پر رستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑ لی۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں ہو لیے۔ وہ تھوڑی ہی دور چڑھے تھے کہ ان کا رستہ ختم ہو گیا اور وہ تھم گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان پست ہمتوں نے صنعت گری اور دست کاری کی راہ لی تھی کہ روپے کے بھوکے تھے اور جلد محنت کا صلہ چاہتے تھے۔ میں ان لوگوں کے پیچھے تھا۔ جنھوں نے دلاوروں اور جانبازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا تھا اور خیال کیا تھا کہ چڑھائی کے رستے ہم نے پا لیے۔ مگر وہ رستے ایسے پیچ در پیچ اور درہم برہم معلوم دیے کہ تھوڑا ہی آگے بڑھ کر اس کے ہیر پھیر میں سرگرداں ہو گئے۔ ہر چند برابر قدم مارے جاتے تھے مگر جب دیکھا تو بہت کم آگے بڑھتے تھے۔ میرے فرشتۂ رحمت نے ہدایت کی کہ یہ وہی رستے ہیں جہاں عقل صادق اور عزم کامل کام دیتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ فقط چالاکی سے کام کر جائیں۔ بعضے ایسے بھی تھے کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے مگر ایک ہی قدم ایسا بے موقع پڑا کہ جتنا گھنٹوں میں بڑھے تھے اتنا دم بھر میں نیچے آن پڑے بلکہ

بعضے ایسے ہو گئے کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو روزگار سے ترقیاں [۱] حاصل کرتے چلے جاتے ہیں مگر کوئی ایسی حرکت ناشائستہ کرتے ہیں کہ دفعتاً گر پڑتے ہیں اور آئندہ کے لیے بالکل اس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے۔

ہم اتنے عرصے میں بہت اونچے چڑھ گئے اور معلوم ہوا کہ چھوٹے بڑے پہاڑ کے نیچے سے چلے ہیں اوپر آکر دو شاہراہوں سے ملتے ہیں، چنانچہ وہاں آکر تمام صاحب ہمت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان دونوں شاہراہوں میں ذرا ذرا آگے بڑھ کر ایک بھوت، ڈراؤنی صورت، ہیبت ناک مورت کھڑا تھا کہ آگے جانے سے روکتا تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک درخت خار دار کا ٹہنا تھا۔ بھوت کا نام دیو ہلاک اور کانٹے وہی ترقی کے مانع اور موت کے بہانے تھے جو اولوالعزموں کو راہ ترقی میں پیش آتے ہیں۔ چنانچہ جو سامنے آتا تھا ٹہنے کی مار منہ پر کھاتا تھا۔ دیو کی شکل ایسی خونخوار تھی گویا موت سامنے کھڑی ہے ان کانٹوں کی مار سے غول کے غول اہل ہمت کے بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے اور ڈر ڈر کر چلاتے تھے کہ "ہے ہے موت! ہے ہے موت!"

دوسرے رستے پر جو بھوت تھا اس کا نام حسد تھا۔ پہلے بھوت کی طرح کچھ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ لیکن ڈراؤنی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب کلمے جو اس کی زبان سے نکلتے تھے اس لیے اس کا منہ ایسا برا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ اس کے سامنے ایک کیچڑ کا حوض بھرا تھا کہ چھینٹیں اڑا اڑائے جاتا تھا اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا تو اکثر اشخاص ہم میں سے بیدل ہو کر رہ گئے اور بعضے اپنے

---

[۱] ۔ فی الحقیقت جو نام وری اور ترقی کے خواہاں ہیں، اگر سلطنت دولت شجاعت، علمیت وغیرہ کے رستے سے جاتے ہیں تو خوف جان ہے اور اگر فنون کمال کے رستے لیتے ہیں تو حاسد انواع اقسام کی بد ذاتیوں سے سد راہ ہوتے ہیں۔

یہاں تک آنے پر کمال نادم ہوئے۔ میرا یہ حال تھا کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہوا جاتا تھا اور قدم آگے نہ اٹھتا تھا اتنے میں اس شہنائی کی آواز اس تیزی کے ساتھ کان میں آئی کہ بجھے ہوئے ارادے پھر چمک اٹھے۔ جس قدر کہ دل زندہ ہوئے اسی قدر خوف وہراس خاک ہو ہو کر اڑتے گئے، چنانچہ بہت سے قدم مارتے آگے بڑھے' گویا حریف سے میدان جنگ مانگتے ہیں' یہاں تک کہ جہاں دیو کھڑا تھا یہ اس دھانے سے نکل گئے اور وہ موت کے دانت نکالے دیکھتا رہ گیا۔

جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت کے دھیمے تھے وہ اس راستے پر پڑے جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا۔ مگر اس آواز کے ذوق شوق نے انہیں بھی ایسا مست کیا کہ گالیاں کھاتے کیچڑ میں نہاتے مر بچ کر یہ بھی اس کی حد سے نکل گئے۔ چنانچہ جو کچھ رستے کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں وہ بھی ان بھوتوں ہی تک تھیں' آگے دیکھا تو ان کی دسترس سے باہر ہیں اور رستہ بھی صاف وہموار بلکہ ایسا خوش نما ہے کہ مسافر جلد جلد آگے بڑھے اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔

اس میدان روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جاں بخش اور روحانی ہوا چلنے لگی' جس سے روح اور زندگانی کو قوت دوامی حاصل ہوتی تھی۔ تمام میدان جو نظر کے گرد و پیش دکھائی دیتا تھا اس کا رنگ کبھی نور سحر تھا اور کبھی شام شفق جس سے قوس قزح کے رنگ میں کبھی شہرت عام اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور و سرور کا عالم دل کو اس طرح تسلی و تشفی دیتا تھا کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے دھوئے جاتے تھے اور اس مجمع عام میں امن و امان اور دلی آرام پھیلتا تھا جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر عیاں تھا۔

ناگہاں ایک ایوان عالی شان دکھائی دیا کہ اس کے چار طرف پھاٹک تھے، اس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختے میں ایک پری حور شمائل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے اور وہی شہنائی بجا رہی ہے۔ جس کے میٹھے میٹھے سروں نے ان مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی اور سروں

نے ان مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی۔ اور سروں سے اب ایسی صدا آتی تھی گویا آنے والوں کو آفرین و شاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ "خیر مقدم! خیر مقدم! خوش آمدید!! صفا آوردید!"

اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا، چنانچہ مورخوں کا گروہ ایک دروازہ پر استادہ ہوا تاکہ صاحب مراتب اشخاص کو حسب مدارج ایوان جلوس میں داخل کرے۔ یکایک وہ شہنائی جس سے کبھی شوق انگیز جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سر نکلتے تھے، اب اس سے ظفریابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا اور دروازے خود بخود کھل گئے۔

جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا معلوم ہوا کہ کوئی راجوں کا راجہ مہاراجہ ہے۔ چاند کی روشنی چہرے کے گرد ہالہ کیے ہے، سر پر سورج کی کرن کا تاج ہے۔ اس کے استقلال کو دیکھ کر لنکا کا کوٹ پانی پانی ہوا جاتا ہے، اس کی حق داری جنگل اور پہاڑوں کے حیوانوں کو جاں نثاری میں حاضر کرتی ہے، تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سایہ میں لیے آتے ہیں، فرقہ فرقہ کے علما اور مورخ اسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے لینے کو بڑھے اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا۔ مگر ایک شخص کہن سالہ رنگت کا کالا ایک پوتھی بغل میں لیے ہندوؤں کے غول سے نکلا اور بہ آواز بلند چلایا کہ: "آنکھوں والو! کچھ خبر ہے؟ دیکھو دیکھو ترتیب کے سلسلے کو برہم نہ کرو اور نرنکار کے نور کو اجسام خاک میں نہ ملاؤ"۔ یہ کہہ کر آگے بڑھا اور اپنی پوتھی نذر گزرانی، اس نے نذر قبول کی اور نہایت خوشی سے اسے لینے کو ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ اس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، کوئی کچھ سمجھا، کوئی کچھ سمجھا[ؔ] اس وقت ایک بیان یعنی تخت ہوادار آیا وہ اس پر سوار ہو کر آسمان کو اڑ گیا، معلوم ہوا کہ یہ رام چندر جی ہیں۔

ؔ۔ کوئی اوتار کہتا ہے، کوئی بادشاہ یا اقبال۔

اور یہ والمیک ہے جس نے رامائن نذر دی ۔

سب لوگ ابھی والمیک کی ہدایت کا شکریہ ہی ادا کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک اور آمد آمد ہوئی ۔ دیکھا کہ ایک تخت طلسمات کو بتیس پریاں اڑائے لیے آتی ہیں۔ اس پر ایک اور راجہ بیٹھا ہے ۔ مگر نہایت دیرینہ سال' اسے فرقہ فرقہ کے علما اور مورخ لینے کو نکلے مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بے قراری سے دوڑے۔ معلوم ہوا کہ راجہ تو مہاراجہ بکرماجیت تھے اور سنگھاسن بتیسی' پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہو گئیں کہ: "جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی ہے نہ آپ کا من ہٹے گا نہ سکہ مٹے گا" برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی اور انہیں لے جا کر ایک مسند پر بٹھا دیا ۔

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل قال ہوئی ۔کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے اور ارا کین دربار کہتے تھے کہ یہاں تمکنت اور غرور کا گذارہ نہیں ۔ اتنے میں وہی بتیس پریاں پھر آئیں ۔چنانچہ ان کی سفارش سے اسے بھی لے گئے جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا ایک پنڈت آیا دونوں ہاتھ اٹھا کر اشیرباد کہی اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا جس میں ہیرے اور پنے کے نورے دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے ۔ معلوم ہوا کہ یہ راجہ بھوج تھے اور بتیس پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب سنگھاسن بتیسی تھی جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ کالیداس شاعر تھا جس نے ان کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ۔

اس طرف برابر یہی کاروبار جاری تھے ۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے دروازے سے بھی داخلہ شروع ہوا ۔ میں اس طرف متوجہ ہوا' دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش فروش' جھاڑ فانوس سے بقعہ نور بنا ہوا ہے ۔ایک جوان پیل پیکر ہاتھ میں گرز گاو سر نشۂ شجاعت میں مست' جھومتا جھامتا چلا آتا ہے ۔ جہاں قدم رکھتا ہے ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے' گرد اس کے شاہان کیانی اور پہلوانان ایرانی موجود ہیں کہ درفش کاویانی کے سایۂ بے زوال میں لیے آتے ہیں' حب قوم اور حب وطن اس کے

دائیں بائیں پھول برساتے تھے، اس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا اور سر پر کلہ شیر کا خود فولادی دھرا تھا۔ مورخ اور شعرا، اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے، سب نے بچشم تعظیم دیکھا، ان ہی میں سے ایک پیر مرد دیرینہ سال جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار نمایاں تھے، وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا اور ایک کرسی پر بٹھا دیا جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اٹھائے کھڑے تھے۔ پھر پیر مرد نے اہل مجلس کی طرف متوجہ ہوکر چند اشعار نہایت زور شور سے پڑھے نہیں بلکہ اس کے کارناموں کی تصویر صفحۂ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی جو قیامت تک رہے گی، بہادر پہلوان نے اٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گل فردوس کا طرہ اس کے سر پر آویزاں کرکے دعا کی کہ الٰہی یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے۔ تمام اہل محفل نے آمین کہی، معلوم ہوا کہ وہ بہادر ایران کا حامی شیر سیستانی رستم پہلوان اور کہن سال فردوسی ہے جو شاہنامہ لکھ کر اس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا جس کا حسن شباب نوخیز اور دل بہادری شجاعت سے لبریز تھا۔ سر پر تاج شاہی مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو چراتی تھی ساتھ اس کے حکمت یونانی سر پر چتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا مگر سب اسے دیکھ کر ایسے محو ہو گئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہت سے مورخ اور محقق اس کے لینے کو بڑھے مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اس تخت کی طرف لے چلے جو کہانیاں اور افسانوں کے نام وروں کے لیے تیار ہوا تھا چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا، ایک انبوہ کو چیر کر نکلا، وہ کوئی یونانی مورخ تھا اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھایا۔ فرشتۂ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشے کی اس طرف آجاؤ تاکہ تمہاری نظر سب پر پڑے اور تمہیں کوئی نہ دیکھے۔ یہ سکندر یونانی ہے، جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیے ہیں۔

اس کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہ کیانی اور اس پر درفش

کاویانی جھومتا تھا، مگر پھریرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا گویا اپنے زخم کو بچائے ہوئے آتا ہے، رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا جب وہ آیا تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اٹھا اور اپنے برابر بٹھایا باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا اس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی وہ دارا بادشاہ ایران تھا۔

دفعتاً سکندر نے آواز دی "انہیں بلاؤ" جو شخص داخل ہوا وہ ایک پیرمرد بزرگ صورت تھا کہ مقیشی داڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا سکندر خود اٹھا، اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا اپنے برابر کرسی پر بٹھایا اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا معلوم ہوا کہ یہ نظامی گنجوی ہیں اور اس سہرے میں خمسہ کے مضامین پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی چھڑک کر کہا: "اب یہ کبھی نہ کملائیں گے۔"

بعد اس کے جو شخص آیا اگرچہ سادہ وضع تھا مگر قیافہ روشن اور چہرہ فرحت روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آچکے تھے ان سب سے زیادہ عالی رتبہ کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا اور بائیں جالینوس اس کا نام سقراط تھا، چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا، لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے استاد یعنی افلاطون سے دوسرے درجہ پر بیٹھے گا مگر اس مقدمہ پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ ان کا سر گروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے مگر دلائل زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہل محفل کو قائل کر لیا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے اور یہ کہہ کر اول سکندر کو آئینہ دکھایا اور پھر نظامی کو سلام کر کے بیٹھ ہی گیا۔

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کے ذیل میں آیا، سب جبہ وعمامہ اور طبل و دمامہ رکھتے تھے مگر باہر روکے گئے، کیوں کہ ہر چند ان کے جبے دامن قیامت سے دامن باندھتے تھے اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے۔ مگر اکثر ان میں طبل تہی کی طرح

اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لئے منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک انبوہ کثیر علما و فضلا کا ہولیا۔ تعجب یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اتارے ان کے ساتھ تھے۔ بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لیے اشیرباد کہتے آتے تھے۔ پہلا بادشاہ ان میں ہارون رشید اور دوسرا مامون رشید تھا۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا۔ ولایتی استخواں اور ولایتی لباس تھا اور جامہ خون سے گلکار تھا۔ ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور ہاتھ میں لیے تھا۔ کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ ہر چند یہ جواہرات اپنی آبداری سے پانی ٹپکاتے تھے مگر جہاں قدم رکھتا تھا بجائے غبار کے آہوں کے دھوئیں اٹھتے تھے، وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے مصنف اس کے استقبال کو بڑھے مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوان حور شمائل آیا اور فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور شکر گذاری سے ہاتھ اس کا پکڑا۔ اگرچہ برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا وہ ایاز تھا۔

اسی عرصہ میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہل اسلام رکھتا تھا مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملتا تھا۔ اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہو گئے مگر تمام علما و فضلا میں تکرار اور قیل و قال کا غل ہوا اس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا ارسطو کے مقابل ایک کرسی بچھی تھی اس پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ بوعلی سینا تھا۔

ایک انبوہ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے۔ مگر انداز ہر ایک کے جدا جدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق ان کے نقش و نگار سے گلزار تھے وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مصور ہیں۔ ان کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا کہ مصور بے شک اچھے ہو مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیا کے مصور ہو۔ تمہاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں۔ البتہ انتخاب ہو سکتا ہے۔ یہ

لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چنانچہ "انوری" "خاقانی" "ظہیر فاریابی" وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندر آئے باقی سب نکالے گئے۔ ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا اس میں سے آب حیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں مگر کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانیں لہراتی نظر آتی تھیں۔ اس لیے اس پر پھر تکرار ہوئی۔ اس نے کہا کہ بادشاہوں کو خدا نے دفع اعدا کے لیے تلوار دی ہے مگر ملک مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگر چند بوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں تو اعدائے بد نہاد ہمارے خون عزت بہانے سے کب چوکیں چناں چہ یہ عذر اس کا قبول ہوا۔ یہ انوری تھا جو باوجود گل افشانی فصاحت کے بعض موقعہ پر اس قدر ہجو کرتا تھا کہ کان اس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ خاقانی پر اس معاملے میں اس کے استاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے چوں کہ اس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی اس لیے وہ بھی اس کی کرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہو سکا۔

اس عرصہ میں چنگیز خان آیا۔ اس کے لیے گو علما اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے اسے چشم حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا۔ البتہ مورخوں کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی۔ جب کسی کی زبان سے نسب نامے کا لفظ نکلا تو اس نے فوراً شمشیر جوہر دار صنعت کے طور پر پیش کی جس پر خونیں حرفوں سے رقم تھا۔ "سلطنت میں میراث نہیں چلتی" علما نے غل مچایا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بو آئے وہ قصاب ہے بادشاہوں میں اس کا کام نہیں شعرا نے کہا جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصوران تصانیف کی تحریر نے رنگ بقانہ ڈالا ہو اسے اس دربار میں نہ آنے دیں گے۔ اس بات پر اس نے بھی تامل لیا اور متاسف معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہاتف نے آواز دی کہ "اے چنگیز! جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون نے حرکت دی، اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اٹھاتا۔"

اتنے میں چند مورخ آگے بڑھے انھوں نے کچھ ورق دکھائے کہ ان میں

طورۂ چنگیز خانی یعنی ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا کہ اسے دربار میں جگہ دو مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ شان کا اور آیا۔ اس کا نام ہلاکو خان تھا۔ اس کے لیے چند علما نے بھی مورخوں کا ساتھ دیا۔[۱] جس وقت اندر لائے تو اس کے لیے بھی تکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک مرد بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا جس کی وضع متشرع عالموں کی تھی لیکن کمر میں ایک طرف اصطرلاب دوسری طرف اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں۔ بغل میں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزا تھے۔ ان کا نام محقق طوسی تھا، چنانچہ انھیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اسے بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقق کو بوعلی سینا نے یہ کہہ کر پاس بٹھالیا کہ آپ نے میری کلاہ شہرت میں بقائے دوام کے آبدار موتی ٹانکے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مورخوں نے اس کے لانے کی التجا کی، مگر وہ سب کو دروازہ پر چھوڑ گیا اور اپنا آپ رہبر ہوا کیوں کہ وہ مورخ تھا، رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہنچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہل تصنیف میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ وہ ہماری شمشیر کے عوض خدا نے جو تمہیں قلم تحریر دیا اسے اظہار واقعیت اور خلایق کی عبرت اور نصیحت کے لیے کام میں لانا چاہیے یا اغراض نفسانی اور بدزبانی میں؟" تمام مورخ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ یہ کس پر اشارہ ہے۔ اس پر امیر تیمور نے ابن عرب شاہ کو بلانے کو ایما فرمایا، معلوم ہوا کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا، چنانچہ اس کا نام مصنفوں کی فہرست سے نکالا گیا۔

---

[۱] اس کے عہد میں علوم و فنون نے بڑی ترقی کی تھی۔ خصوصاً علم ہئیت کی کتابیں اور رسد خانے کی تعمیر اس کی شاہد حال ہیں۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آزاد وضع قطع تعلق کا لباس بر میں خاکساری کا عمامہ سر پر آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں تمام علما و صلحا، مورخ و شاعر سر جھکائے ان کے ساتھ ہیں، وہ دروازہ پر آکر ٹھہرے، سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا، "معذور رکھو میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے" اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے جاتے اگر تمام اہل دربار کا شوق طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے، ایک طلسمات کا شیشۂ مینائی ان کے ہاتھ میں تھا کہ اس میں کسی کو دودھ کسی کو شربت، کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کرسی نشین انہیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا، مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے۔ فقط اس سرے سے اس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ حافظ شیرازی تھے اور شیشۂ مینائی ان کا دیوان تھا جو فلک مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔

لوگ اور کرسی نشین ان کے مشتاق تھے کہ دور سے دیکھا بے شمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں ان کے ایک پیر مرد نورانی صورت جس کی سفید ڈاڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے ایک طرہ سر پر آویزاں کیا تھا، اس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے، مگر انہیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے کیوں کہ ایسا کون تھا جو شیخ سعدی اور ان کی گلستان بوستان کو نہ جانتا تھا۔ انہوں نے کمرہ کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا۔ اس بیچارے کو ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھی، لیکن اور کرسی نشین کہ اکثر ان سے واقف تھے اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے، وہ ان کے مشتاق معلوم ہوئے باوجود اس کے یہ ہنسے اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے۔ " دنیا دیکھنے کے لیے ہے برتنے کے لیے نہیں"۔

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اولوالعزم شخص آیا جس کے چہرے سے خودسری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل ملتا

تھا۔ اس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علما کی نہیں تو مورخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہئے، بلکہ چغتائی خاندان کے مورخ صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اس نے باوجود اس کے ایک کرسی جس پر تیموری تمغہ بھی لگا تھا گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا، ہمایوں اسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکالیا۔ مگر پھر تاج شاہی پر انداز کج کلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ "بے حق بے استقلال ہے"، اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ: مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ "میرے دشمن اور ان کی اولاد میرے رستے پر قدم بقدم چلیں گے اور فخر کریں گے"۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا۔ جس کو انبوہ کثیر ایرانی، تورانی ہندوستانیوں کے فرقہائے مختلفہ کا بیچ میں لیے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا، تمام اہل دربار کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور رضا مندی عام کی ہوا چلی، تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اس کو مسلمان سمجھتے تھے، ہندو اسے ہندو جانتے تھے، آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا، نصاریٰ اس کو نصاریٰ سمجھتے تھے۔ مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے۔ اس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی شکایت کرکے بدایونی پر خون کا دعویٰ کیا کہ اس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا اور وہ فتحیاب ہوتا اگرچند منصف مصنفوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا: "نیت کا پھل ہے"

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا وہ خود مخمور نشہ میں چور تھا، ایک صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی۔ اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی، وہ جو کچھ دیکھتا تھا اس کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اسی کی زبان سے کہتا تھا، اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نورجہاں تھی۔

شاہجہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مورخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیے تھے اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت ان عمارتوں کے فوٹوگراف ہاتھ میں لیے تھے جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی تھیں اور سینکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضامندی عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا چند بچوں کو ساتھ لیے آیا اپنی آنکھوں کا اور بچوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہریار شاہجہاں کا چھوٹا بھائی تھا اور بچے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اس کے آگے بڑھا اور کہا کہ: "جو کیا گیا بدنیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا۔ بلکہ خلق خدا کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا" بہر حال اسے دربار میں جگہ ملی اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجہ پر ممتاز ہوا۔

ایک تاجدار آیا کہ جبہ اور عمامہ سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا دوسرے ہاتھ میں جو فرد حساب تھی اس میں غرق تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پرتالتا ہے۔ سب نے دیکھ کر کہا کہ انھیں خانقاہ میں لے جانا چاہیے، اس دربار میں ان کا کچھ کام نہیں۔ لیکن ایک ولایتی کہ بظاہر مقطع اور معقول نظر آتا تھا وہ دونو ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا اور کہا کہ " اے ارکین دربار! ہمارے ظل سبحانی نے اس کمبخت سلطنت کے لیے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہ کیا، اس پر بھی تمہارے اس دربار میں اسے جگہ نہ دیں گے"۔ یہ لطیفہ اس نے اس مسخرہ پن سے ادا کیا کہ سب مسکرائے اور تجویز ہوئی کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر میں انھیں بھی جگہ دے دو۔ معلوم ہوا کہ عالم گیر بادشاہ اور ساتھ اس کے نعمت خاں عالی تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بینڈا جوان دکھنی وضع، جنگ کے ہتیار لگائے، راجگی کے سکے تمغے سے سجا ہوا آیا۔ اس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوئے، بلکہ عالم گیر کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر وہ کرسی کھینچ اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بولا کہ "صاحب ہمت کو جگہ دو یا نہ دو وہ آپ جگہ پیدا کر لیتا ہے" یہ سیواجی تھا جس سے مرہٹہ خاندان

کی بنیاد قائم ہوئی ہے ۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اس کے ایک بادشاہ آیا ۔ اس کی وضع ہندوستانی تھی، مصنفوں اور مورخوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے کہ کوئی ان میں گویا اور کوئی بھانڈ، کوئی مسخرہ نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آئے تھے، کیونکہ ایک ولایتی دلاور ان کے پیچھے شمشیر برہنہ علم کیے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں مخمل رومی کی کلاہ تھی جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا اور اسپ بخارائی زیرران تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمد شاہ تھا اسے دیکھتے ہی سب نے کہا " نکالو نکالو ! ان کا یہاں کچھ کام نہیں " چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے ۔ ولایتی مذکور نادر شاہ تھا جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کر کے تاج ہندوستان سر پر رکھا تھا ۔ اسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی ۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا، ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا کوئی گلدستہ ہاتھ میں لیے تھا، انہیں دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کر کے اشعار پڑھتے تھے ۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے ۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے ۔ اس میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا اس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے ۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلاتے تھے، مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے، پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے ۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا ۔ وہ مرزا رفیع سودا تھے ۔

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے ۔ شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے، درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بے زار کیے دیتی تھی ۔ میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے ۔ میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے، دم میں عالم ذی وقار، متقی و پرہیزگار، دم میں ڈاڑھی چٹ، بنگ کا سوٹا کندھے پر ۔ جرأت کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا، جب

وہ میٹھی زبان سے ایک تان اڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے، ناسخ کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی۔ اور اکثر جگہ قلمکاری اس کی عینک کی محتاج تھی مگر آتش کی آتش زبانی اسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی مومن کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے جرأت کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ ایک پیر مرد دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس جامہ پہنے کھڑکی دار پگڑی باندھے جریب ٹیکتے آتے تھے، مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے، بانکے صاحب ضرور ان سے دست و گریباں ہو جاتے لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا یہ بچا لیتے تھے، بڈھے میر امن دہلوی چار درویش کے مصنف تھے اور بانکے صاحب، مرزا سرور فسانۂ عجائب والے تھے۔ ذوق کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار مہک گیا، انھوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا، مگر سب واہ واہ سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے۔ بس اتنے میں آواز آئی کہ آزاد کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگہ میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔ مگر وہیں پھر کوئی بولا کہ اسے جن لوگوں میں بیٹھا دو گے بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا کہ اس کے قلم نے ایک جہاں سے لڑائی باندھ رکھی ہے، اسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیئے۔ اس مقدمہ پر قیل و قال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرے سے الٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادی، ہمدم یعنی فرشتۂ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصاحبت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی، مردوں سے زندوں میں تو آیا۔

سیرت النبیؐ

(مولوی شبلی نعمانی)

ظہور قدسی

چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

ولادت

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے، جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیمؑ، جمال یوسفؑ، معجز طرازی موسیٰؑ، جاں نوازی مسیحؑ، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہ کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں کام آئیں گے

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ "آج رات ایوان کسریٰ کے (۱۴) کنگرے گر گئے آتش کدہ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہوگیا" لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں، بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا۔ چمنستان سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس

چمک اٹھا۔ یعنی یتیم عبداللہ جگر گوشۂ آمنہ، شاہ حرم، حکمران عرب، فرماں روائے عالم شہنشاہ کونین:

شمسۂ نہ مسند ہفت اختراں — ختم رسل خاتم پیغمبراں
احمد مرسل کہ خرد خاک اوست — ہر دو جہاں بستۂ فتراک اوست
امی و گویا بہ زبان فصیح — از الف آدم و میم مسیح
رسم ترنج است کہ در روزگار — پیش دھد میوہ، پس آرد بہار

عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا، اللھم صلی علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم۔

تاریخ ولادت

تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہئیت داں عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے دلائل ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپ کی ولادت ۹ ربیع الاول روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل سنہ ۵۷۱ء میں ہوئی تھی۔[۱]

آپ کا نام محمدؐ رکھا گیا اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے یہ نام رکھا۔

---

(۱) محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے وہ کئی صفحوں میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیم (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا۔ اور سنہ ۱۰ھ تھا (اور اس وقت آپ کی عمر کا ترسٹھواں سال تھا۔

۲۔ ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ (سنہ ۱۰ھ) کا گرہن ۷ جنوری سنہ ۶۳۲ء کو ۸ بجکر ۳۰ منٹ پر لگا تھا۔

۳۔ اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ۶۳ برس پیچھے ہٹیں تو آپ کی پیدائش

رضاعت

سب سے پہلے آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آپ کی والدہ نے اور دو تین روز کے بعد ثویبہ نے دودھ پلایا جو ابو لہب کی لونڈی تھی۔[2]

ثویبہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ کو دودھ پلایا۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ شہر کے روسا و شرفا شیر خوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے یہ رواج اس غرض سے تھا کہ بچے بدوؤں میں پل کر فصاحت کا جوہر پیدا کرتے تھے[3] اور عرب کی خالص خصوصیات محفوظ رہتی تھیں۔

کا سال سنہ ۵۷۱ء ہے (جس میں از روے قواعد ہیئت) ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲ اپریل سنہ ۵۷۱ء کے مطابق تھی)۔

۴۔ تاریخ ولادت میں اختلاف ہے لیکن اس قدر متفق علیہ کہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ ۸ سے لے کر ۱۲ تک میں منحصر ہے۔

۵۔ ربیع الاول مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے ان وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت قطعاً ۲۰ اپریل سنہ ۵۷۱ء تھی۔

[2] بخاری باب یحرم الرضاعۃ ما یحرم من النسب ۰ س“

[3] امام سہیلی نے بہ تفصیل یہ واقعات لکھے ہیں اور یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں اس لیے فصیح ہوں کہ بنی سعد کے قبیلہ میں پلا ہوں (الروض الانف جلد اول ۱۰۶ س) سر ولیم میور صاحب لائف آف محمد میں لکھتے ہیں کہ محمد کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی ان کے اخلاق آزاد اور مستغنی عن الغیر تھے۔ جس کی وجہ ان کا پانچ سال تک بنی سعد میں بسر کرنا تھا اور اسی وجہ سے ان کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کے خالص نمونہ کے موافق تھی۔

شرفائے عرب نے مدت تک اس رسم کو محفوظ رکھا، یہاں تک کہ بنوامیہ نے دمشق میں پائے تخت قائم کیا اور شاہانہ شان و شوکت میں کسریٰ و قیصر کی ہمسری کی۔ تاہم ان کے بچے صحراؤں میں بدوؤں کے گھر پلتے تھے، ولید بن عبدالملک خاص اسباب سے نہ جا سکا اور حرم شاہی میں پلا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان بنوامیہ میں صرف ولید ہی ایک شخص تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا۔[1]

غرض، دستور مذکور کی بنا پر سال میں دو مرتبہ دیہات سے شہر میں عورتیں آیا کرتی تھیں اور شرفائے شہر اپنے شیرخوار بچوں کو ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے، اس دستور کے موافق آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت کے چند روز بعد قبیلہ ہوازن کی چند عورتیں بچوں کی تلاش میں آئیں، ان میں حضرت حلیمہ سعدیہ بھی تھیں[2] اتفاق سے ان کو کوئی بچہ ہاتھ نہیں آیا۔ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی والدہ نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو ان کو خیال آیا کہ یتیم بچے کو لے کر کیا کروں گی۔ لیکن ہاتھ خالی بھی نہ جا سکتی تھیں اس لیے حضرت آمنہ کی درخواست قبول کی اور آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر گئیں۔ ان کی ایک صاحبزادی تھیں جن کا نام شیماؔ تھا۔ ان کو آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بہت انس تھا۔ وہی آپ کو کھلایا کرتی تھیں۔ دو برس کے بعد حلیمہ (رض)

---

[1] ۔ ابن اثیر ج ۵ صفحہ ۶ طبع لیڈن، س

[2] ۔ سہیلی نے لکھا ہے کہ عرب میں دودھ پلانا اور اس کی اجرت لینا شریفانہ کام خیال نہیں کیا جاتا تھا، اسی بنا پر عرب میں مثل ہے۔ لحرہ لا تاکل بثدیھا اس بنا پر سہیلی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سال قحط پڑا تھا اس لیے مجبوراً حضرت حلیمہ (رض) اور ان کے قبیلہ نے یہ خدمت گوارا کی تھی۔ لیکن تمام تاریخوں میں ہے کہ مکہ میں ہر سال باہر سے عورتیں اس کام کے لیے آیا کرتی تھیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کام کو معیوب سمجھنا عرب کا عام خیال نہ تھا۔ اہل شہر اور امرا کے ساتھ مخصوص ہو گا۔

آپ کو مکہ میں لائیں اور آپ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کیا۔ لیکن چوں کہ اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی' آپ کی والدہ نے فرمایا کہ واپس لے جاؤ۔ چنانچہ دوبارہ گھر لائیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ آپ حضرت حلیمہ کے یہاں کے برس تک رہے ابن اسحاق نے وثوق کے ساتھ ۶ برس لکھا ہے۔

ہوازن کا قبیلہ فصاحت و بلاغت میں مشہور ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ "میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے" [۱]

بنی سعد ہوازن ہی کے قبیلہ کو کہتے ہیں۔

حضرت حلیمہ کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا محبت تھی۔ عہد نبوت میں جب وہ آپ کے پاس آئیں تو میری ماں میری ماں کہہ کر لپٹ گئے۔ یہ دلچسپ واقعات آگے آئیں گے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی :۔ت سے پہلے وفات کر گئیں' لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن خیثمہ نے "تاریخ" میں۔ ابن جوزی نے "حدائیں منذری نے "مختصر سنن ابی داؤد" میں' ابن حجر نے "اصابہ" میں' ان کے اسلام لانے کی تصریح کی ہے۔ حافظ خلطائی نے ان کے اسلام پر مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام "التحفة الجسیمة فی اثبات اسلام حلیمة" ہے [۲]

حارث

حضرت حلیمہ کے شوہر یعنی آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رضاعی باپ

---

[۱] ۔ طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۷۱۔

[۲] زرقانی جلد ۲ ص ۲۶۱۔

کا نام حارث ابن عبدالعزیٰ ہے ۔ وہ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے بعد مکہ آئے اور اسلام لائے [۱]

حارث آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور کہا کہ یہ تم کیا کہتے ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں وہ دن آئے گا کہ میں آپ کو دکھادوں گا کہ میں سچ کہتا تھا۔ حارث مسلمان ہو گئے ۔

رضاعی بھائی بہن

آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چار رضاعی بھائی بہن تھے، جن کے نام یہ ہیں ۔ عبداللہ ۔ انیسہ ۔ حذیفہ اور حذافہ جو شیماؔ کے لقب سے مشہور تھیں ۔ ان میں سے عبداللہ اور شیماؔ کا اسلام لانا ثابت ہے ۔ باقیوں کا حال معلوم نہیں ۔

مدینہ کا سفر

آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر جب چھ برس کی ہوئی تو آپ کی والدہ آپ کو لے کر مدینہ گئیں ۔ چوں کہ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دادا کی ننھیال خاندان نجار میں تھی، وہیں ٹھہریں ۔ اس سفر میں اُمّ ایمن (رض) بھی ساتھ تھیں، جو آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دایہ تھیں ۔ مورخین نے لکھا ہے کہ آپ کی والدہ اس ننھالی رشتہ کی وجہ سے مدینہ گئیں ۔ لیکن یہ رشتہ دور کا رشتہ تھا، قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق پر اتنا بڑا سفر کیا جائے، میرے نزدیک مورخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے گئی تھیں، جو مدینہ میں مدفون تھے ۔ بہر حال ایک مہینہ تک مدینہ میں مقیم رہیں ۔ واپس آتے ہوئے جب مقام ابواء[۲]

---

[۱] ۔ اصابہ فی احوال الصحابہ مطبوعہ مصر مطبع سعادت جلد اول ص ۲۸۲ ۔

[۲] ۔ ایک گاؤں کا جو جحفہ سے ۲۳ پر واقع ہے ۔

میں پہنچیں تو ان کا انتقال ہو گیا اور یہیں مدفون ہوئیں۔ ام ایمن آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر مکہ میں آئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ وسلم کو قیام مدینہ کی بہت سی باتیں یاد رہ گئی تھیں۔ جب قیام مدینہ کے زمانے میں ایک دفعہ بنو عدی کے منازل پر گذرے تو فرمایا کہ اسی مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں، یہی وہ تالاب ہے جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا۔ اسی میدان میں انیسہ ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔

عبدالمطلب کی کفالت

والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد عبدالمطلب نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دامن تربیت میں لیا۔ ہمیشہ آپ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے [۱]

---

[۱] عبدالمطلب کا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز رکھنا ایک مسلم واقعہ ہے۔ لیکن مارگولیس صاحب کو دادا کا پوتے پر مہربان ہونا بھی گوارہ نہیں۔ فرماتے ہیں کہ "یتیم لڑکے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ اور اخیر زندگی میں ان کے چچا حمزہ (رض) نے نشہ کی حالت میں طنزاً اپنے باپ کا غلام کہا تھا"۔ (لائف آف محمد از مارگولیس صفحہ ۴۵ تا ۴۶) حضرت حمزہ (رض) کے جس قول سے استدلال کیا ہے مارگولیس خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نشہ کی حالت تھی۔ اس کی تفصیل جیسا کہ بخاری (غزوۂ بدر وخمس) میں ہے کہ بدر کے مال غنیمت سے ان کو دو اونٹ ملے تھے اس وقت تک شراب حرام نہیں تھی۔ حضرت حمزہ رض شراب میں مخمور ادھر سے گذرے اور اونٹ کا پیٹ پھاڑ کر دل اور جگر کا کباب بنایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ حضرت حمزہ رض کے پاس گئے اور ان کو بہت ملامت کی۔ حضرت حمزہ رض سخت مخمور تھے۔ اس حالت میں وہ لفظ نکلے تھے۔ کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے؟۔

عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی اور حجون میں مدفون ہوئے اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ عبدالمطلب کا جنازہ اٹھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ تھے اور فرط محبت سے روتے جاتے تھے۔ عبدالمطلب نے وفات کے وقت اپنے بیٹے ابوطالب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سپرد کی۔ ابوطالب نے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ یہ واقعہ خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عبدالمطلب کی موت نے بنوہاشم کے امتیاز کو دفعتاً گھٹا دیا اور یہ پہلا دن تھا کہ دنیوی اقتدار سے بنوامیہ کا خاندان بنوہاشم پر غالب آ گیا عبدالمطلب کی مسند ریاست پر اب حرب متمکن ہوا۔ جو امیہ کا نامور فرزند تھا۔ مناصب ریاست میں سے صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس رضؓ کے ہاتھ میں رہا جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

ابوطالب کی کفالت

عبدالمطلب کے دس بیٹے مختلف ازواج سے تھے۔ ان میں سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ اور ابوطالب ماں جائے بھائی تھے اس لئے عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپ کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ سوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر سوتے اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے۔

غالباً آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپ نے بکریاں چرائیں۔ فرانس کے ایک نامور مورخ نے لکھا ہے کہ " ابوطالب چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ذلیل رکھتے اس لیے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے"۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا۔ بڑے بڑے شرفا اور امرا کے بچے بکریاں چراتے تھے۔ خود قرآن مجید میں ہے " ولکم فیہا جمال حین تریحون وحین تسرحون "۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا، زمانۂ رسالت میں آپ

اس سادہ اور پر لطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے صحابہ جھر بیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے آپ نے فرمایا جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں زیادہ مزے کے ہوتے ہیں یہ میرا اس زمانہ کا تجربہ ہے جب میں بچپن میں بکریاں چرایا کرتا تھا[ا]

شام کا سفر

ابو طالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے۔ قریش کا دستور تھا کہ سال میں ایک دفعہ تجارت کی غرض سے شام کو جایا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی کہ ابوطالب نے حسب دستور شام کا ارادہ کیا۔ سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے لیکن آنحضرت صلعم

ا۔ طبقات ابن سعد ۸۰ جلد اول بخاری نے کتب الاجارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کیا ہے کہ۔
"میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا" قراریط کے معنی میں اختلاف ہے۔ ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید بن سعد کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے اور قیراط درہم و دینار کے ٹکڑے کا نام ہے۔ اس بنا پر ان کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجرت پر لوگوں کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارہ میں نقل کیا ہے۔ لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قیراط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے۔ ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے۔ اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے (عینی جلد ۶ صفحہ ۶۳۱) نور النبراس میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

کو ابو طالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابو طالب چلنے لگے تو آپ ان سے لپٹ گئے ابو طالب نے آپ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا۔ عام مورخین کے موافق بحیرہ کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب ابو طالب بصریٰ میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے جس کا نام بحیرہ تھا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا کہ یہ سید المرسلین ہیں۔ لوگوں نے پوچھا تم نے کیوں کر جانا؟ اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے سب سجدہ کے لیے جھک گئے۔

یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے۔ سر ولیم میور، ڈریپر، مارگولیوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتائے تھے انہی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی۔ اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح وحواشی ہیں۔[1]

---

[1] ڈریپر صاحب معرکہ علم و مذہب میں لکھتے ہیں۔

"بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی ...... آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا ...... بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقے کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا"۔

سر ولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت مذکور ہے۔ اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں۔ قیاس میں بھی نہیں آ سکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھلا دیئے جائیں اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ روایت ناقابل اعتبار ہے۔ اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں، یعنی راوی اول واقعہ کے وقت موجود نہ تھا اور اس راوی کا نام بیان نہیں کرتا جو شریک واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہے کہ "حسن اور غریب ہے اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں جانتے"۔ حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

۲۔ اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے۔ اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے لیکن اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ "عبدالرحمٰن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے جن میں سب سے بڑھ کر منکر روایت وہ ہے۔ جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے۔"

۳۔ حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے" علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول

(بہ سلسلہ صفحہ گذشتہ)

کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے۔ (لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام بالفرض عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینے میں پیدا ہو سکتا جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے)

نقل کرکے لکھا ہے کہ "میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں"۔[ل]

۴۔ روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلال رضؓ اور ابوبکر رضؓ بھی اس سفر میں شریک تھے۔ حالاں کہ اس وقت بلال رضؓ کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابوبکر رضؓ بچے تھے۔

۵۔ اس حدیث کے اخیر راوی ابوموسیٰ اشعری رضؓ ہیں۔ وہ شریک واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے۔ ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے۔ وہ مرسل یا معضل ہے، یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے۔ اور جو روایت معضل ہے اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے۔

۶۔ حافظ ابن حجر رواۃ پرستی کی بنا پر اس حدیث کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن چونکہ حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت بلال رضؓ کی شرکت بداھتہً غلط ہے اس لیے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہوگیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں۔ عبدالرحمن بن غزوان کی نسبت خود ہی انہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ "وہ خطا کرتا تھا، اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے"۔ ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔

ل ۔ نبراس کی شرح عنبر ن ابسر لابن عبدالناس اور زرقانی اور میزان الاعتدال اور اصابہ (تذکرہ عبدالرحمان بن عزوان)، و مستدرک حاکم مع تلخیص جلد ۲ صفحہ ۶۱۵ ق ح

افادات مہدی

(مہدی الافادی)

اُردو لٹریچر کے عناصر خمسہ

آئندہ زمانے میں اردو لٹریچر کی اگر تاریخ لکھی گئی تو انیسویں صدی کا پچھلا دور اس عہد کا "نشاۃ ثانیہ" (یعنی دور جدید) ہوگا، جس میں ایک بازاری زبان جس کا سرمایۂ ناز ایک بے غایت شاعری کا مجموعۂ خودرو تھا منازل ارتقائی طے کرتی ہوئی اس سطح امتیازیہ کے قریب قریب پہنچ گئی جہاں دنیا کی اعلیٰ تر زبانیں اپنا سکہ جما رہی ہیں۔

کل کی بات ہے جب تک سے تک ملا لینا کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ گرمئ محفل کے لیے چند مصرعوں کی پیوندکاریاں لٹریچر کے فرائض سے ہم کو سبک دوش کر دیتی تھیں لیکن اقتضائے وقت کے ساتھ تغیرِ مذاق دیکھئے کہ آج ہم کو ان کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے۔

یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں کوئی چیز نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو۔ ہمارے جذبات بدلے، خیالات بدلے، تغیر حالت کے ساتھ وہ آثار خارجی بھی جن میں گھرے ہوئے تھے کچھ سے کچھ ہو گئے۔ غرض زمین بدلی، آسمان بدلا اور ہم بھی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے، اور ابھی معلوم نہیں مؤثرات خارجی اور واقعات کی قدرتی رو ہم کو کہاں سے کہاں لے جائے گی۔

اس کشمکش اور سلسلۂ انقلابات میں اتنا ہوش کہاں کہ طبقات ارتقائی کی درمیانی کڑیاں آپ کو گنائی جائیں۔ صرف یہ سمجھ لیجیے کہ بوسیدہ اور فانی اجزاء کی جگہ قوی تر عناصر نے لے لی اور اقلیم سخن کی شریف تر ہستیاں عالم وجود میں آئیں جن سے اردو

سا کم سواد لٹریچر ایک دم سے آشنائے فلسفہ ادب ہو گیا۔

میری غرض لائق عزت سرسید، پروفیسر آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی سے ہے جن کے قلم کے سایہ میں اردو یعنی کل کی چھوکری اتنی رودار ہو گئی کہ السنۂ یورپ یعنی مغربی بہنوں سے بے تکلف آنکھیں ملا سکتی ہے۔ ان میں سے ہر شخص مختص النوع خصائص ادبی کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کا آپ مالک ہے اور جس طرح ادب القدما (یعنی کلاسکس) آج واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے، ایک وقت آئے گا جب ان کے ادبیات کا بیشتر حصہ لائق پرستش اور غیر فانی سمجھا جائے گا

یہ موضوع نہایت اہم ہے اور چونکہ بہت پھیلایا جا سکتا ہے اس لیے سرسری طور پر ٹالنا منظور نہیں، بلکہ خواہش ہے کہ آج کل کے اچھے لکھنے والے اس پر قلم آزمائی کریں۔ میری غرض لائف نگاری سے نہیں بلکہ تنقید ادبی (یعنی لٹریری ریویو) چاہتا ہوں۔ جس میں بلحاظ فن فرداً فرداً ہر مصنف کے نتائج فکر کی خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ ایک حد تک تنقیدات عالیہ یعنی ہائر کریٹی سزم کا حق ادا ہو جائے۔

سرسید نے ادب اور معقولات پر جس حد تک مجتہدانہ رنگ چڑھایا دراصل اس کی اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ یہ ان ہی کے قلم کی آواز بازگشت ہے جو ملک میں بڑے سے بڑے مصنف کے لیے دلیل راہ بنی۔ آج جو خیالات بڑی آب و تاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مختلف لباس میں جلوہ گر کیے جاتے ہیں۔ دراصل اسی زبردست اور مستقل شخصیت کے عوارض ہیں، ورنہ پہلے یہ جنس گراں با وصف استطاعت اچھے اچھوں کی دسترس سے باہر تھی۔ سرسید کے کمالات ادبی کا عدم اعتراف صرف ناشکری نہیں بلکہ تاریخی غلطی ہے اور میں خوش ہوں کہ شریف النفس حالی نے آج کل کی بہتر سے بہتر سوانح عمری لکھ کر منحرف طبائع کو بوساطت سخت سے سخت شکست دی جو خیال میں آ سکتی ہے۔ لیکن نئی نسل پچھلا سبق کسی قدر بھول چلی ہے، حالاں کہ سرسید کے حقوق زیادہ تر اسی کی گردن پر ہیں بلکہ مجھے کہنا چاہیے

کہ لٹریچر کے حقوق کا اقتضا یہ ہے کہ سر سید کے علمی کارنامے پر نگاہ عکس ریز ڈالی جائے اور اس کے لیے سید سجاد حیدر (یلدرم) مجھے زیادہ تر موزوں معلوم ہوتے ہیں علامہ نذیر احمد کو میں "ثمر المارہروی" توبہ! سید افتخار عالم کے سر لگانا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے حال میں مولانا کی نہایت مفصل سوانح عمری شائع کی ہے۔ بااستحقاق ان سے بہتر کوئی شخص خیال میں نہیں آتا۔ یہ لکھیں گے اور ہمدردانہ اور نکتہ گسترانہ لکھیں گے، اسی کی ضرورت ہے۔ نذیر احمد گو ایک حد تک "عقلیات" سے ریاں تڑاتے رہے لیکن ادب اور "معقولات" سے متعلق جو دفتر انہوں نے چھوڑا ہے وہ اس قدر اہم ہے کہ سرسری ریمارک کرنا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔ ان کی اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرت بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدت خیال اور ظریفانہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اسی شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر کی جان ہیں۔ اس پر اضافہ کیجیے اردو سی کم مایہ زبان کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا جس پر کلاسیکس کا دھوکا ہو۔

بعض صاحبوں کو غالب کی طرح مشکل کا رونا ہے اور وہ پیوندکاریاں جو ان کی شستہ رفتہ اور برجستہ اردو میں ہوتی ہیں۔ جس میں انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے عام خیال ہے کہ ثقل سے خالی نہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ سب جدت اختراع اور قوت آخذہ کا زور ہے۔ آمد کی رو میں اضطراری طور پر اپنے پرائے کی تفریق نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصے بلحاظ ترکیب و تحلیل اجزائے السنہ غیر گنگا جمنی ہوتے ہیں تاہم متانت اور حسن کلام سے علیحدہ نہیں ہوتے، جو ان کے لٹریچر کا خاصہ طبعی ہے۔ نہ ان کے اچھوتے اور مستقل طرز ادا (اسٹائل) پر جو شارع عام سے الگ تھلگ اور آپ اپنی نظیر ہے کوئی اثر پڑتا ہے۔ جو باتیں اوروں کے ہاں بے گانی ہیں ان کی بے ساختگی اور برجستگی خیال کے ساتھ سلسلۂ بیان میں اس طرح جذب ہو جاتی ہیں کہ مغائرت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر بھی جہاں تک اس حیثیت سے اعتراض کی گنجائش ہے ادب چاہتا ہے سبک نکتہ چینیوں سے ان کا کمال ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ باوصف کمالات علمی جو ایک حد تک اُن کے ہمعصروں کو بھی مرعوب کرنے والے تھے، ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاق سخن کی آزمایش کا بہتر سے بہتر پیرایہ کیا ہوسکتا تھا۔

جس طرح ناول اور تراجم میں یہ رعایت فن اور اپنی قادرالکلامی کا بڑے سے بڑا ثبوت دے سکے۔ لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے مثلاً فلسفہ، تاریخ وغیرہ جس میں وسعت نظر کے ساتھ تحقیق و تنقید، قوت استقرا، تفریق مسائل اور فلسفیانہ استخراج نتائج کے ساتھ غیر منقطع انضباط خیال کی ضرورت ہے، یہ قصداً اس طرف نہیں آتے یہی حد فصل ہے جو شبلی کے قلمرو سے ان کے دائرہ کمالات کو جدا کرتی ہے اور یہی وہ آزادی ہے جس کے آثار ان کے لکچروں میں آپ دیکھیں گے اور جس کی بنا پر یہ اکثر کہا گیا ہے کہ وہ موضوع سخن کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا مرتبہ انشاپردازی چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ صرف زور بیان کا قصور ہے جو اظہار فصاحت میں کسی چیز کا محکوم نہیں ہوتا۔

زمانہ کتنی ہی ترقی کرے اس علم کے پتلے کو پھر پیدا نہیں کرسکتا جس کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں، جہاں تک لایق ادب "مشرقیت" کا تعلق ہے قوم کی یہ آخری بہار تھی۔ جس کے اجزا کچھ اٹھ گئے کچھ باقی ہیں، قدیم علوم کے نام لیوا ایک آدھ سے زیادہ نہیں ہیں جس عربی، مرحوم عربی کو ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈھتے ہیں، علامہ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہوگئی۔ مگر ان کا حصہ غیر فانی یعنی ان کی تصنیفات مرنے والی چیز نہیں۔ وہ اپنی بقائے دایمی کی آپ ضامن ہیں اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا تخیل (آئیڈیل) ہے جس سے دنیا میں کوئی بے نیاز نہیں۔

نذیر احمد کے استادانہ اور باوقار لٹریچر کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی اب ہو نہیں سکتی، لیکن اخلاف کے لیے جس قدر سرمایہ علمی انھوں نے چھوڑا ہے وہ موجودہ اور آیندہ نسلوں کو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ ہم ان کی قیمتی

تصنیفات کو سینہ سے لگائیں گے، آنکھوں میں جگہ دیں گے۔ دائمی جدائی کے بعد ادائے پاس کا حق کچھ تو ادا ہو رہا ہے۔

سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو بوڑھے حالی ہیں یہ ایک ہی وقت میں جہاں فطری شاعر ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے ناثر بھی ہیں۔ لائف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ جس نزاکت کے ساتھ ادائے خیال کے مختلف پہلوؤں سے دیکھتے دیکھتے یہ اپنا مطلب نکال لیتے ہیں، کثرت مواد کے ساتھ بھی دوسرے اس قسم کے لطیف تصرفات نہیں کر سکتے، طبیعت میں ایک چپا تلا خاص طرح کا مادہ ہے جو حشو و زوائد سے غرض نہیں رکھتا اور ساتھ ہی کسی موضوع بحث میں ان نکات متعلقہ کی طرف نہایت خوب صورتی سے فوری انتقال ذہن کا باعث ہوتا ہے جو دراصل اس بحث کی جان ہوتے ہیں۔ لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیئے جائیں۔ یہ سلاست و نفاست قدرت کلام کی آخری حد ہے جو سرسید کے بعد حالی کے حصے میں آئی۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے خیالات مقالات میں جھول جھال یعنی کسی طرح کا "تذبذب فی الرائے" نہیں ہے۔ خالص یک رنگی ہے۔ جسے اصطلاح میں فلسفیانہ کہیے۔ معیار خیال اس قدر بلند پایہ اور سلجھا ہوا ہے کہ کہیں سے یہ بیگانے نہیں ہوتے۔ مجھے ہنسی آتی ہے جب میں سنتا ہوں کہ حالی کی جدید شاعری بلحاظ فن ساقط المعیار ہے اور اس لائق نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے۔ یہ فتویٰ پرانی لکیر کے شیدائیوں کا ہے جو خیر سے یہ بھی نہیں جانتے کہ شاعری دراصل کیا چیز ہے اور اس کا موضوع اصلی کیا ہے۔ بھیڑوں کا ایک غول ہے جو مدت ہوئی آنکھیں بند کیے ایک راستہ پر پڑ لیا اور آگے پیچھے آج تک چلا آیا۔ لیکن ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں نہ ہم اس مجموعۂ روایات پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو پرانے خیال والوں کا سرمایۂ ناز ہے۔ ہم ایک حد تک معصوم حماقتوں سے کسی کی ہوں لطف اٹھانے کے لیے تیار ہیں کیونکہ یہ بھی ایک عیش ہے، صرف اتنا کیجیے کہ برے بھلے حالی کو جدید گروہ کی لائق فخر پیشوائی کے لیے چھوڑ دیجیے۔

میرا خیال ہے حالی کے کلام پر مولوی عبدالحق کھل کر داد سخن دیں گے۔ یہ آج تک باوصف قابلیت اور فلسفیانہ مذاق کے صرف مقدمات پر ٹالتے رہے ان کا مصرف صحیح کچھ اور تھا۔ ان میں مادہ اختراعی (اریجنیلٹی) خاصا ہے مگر قوت فیصلہ کی کمی "صحافت" سے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ حالانکہ ان کا سلیقۂ تحریر سفارشی ہے کہ مستقل تصنیف و تالیف کے سوا یہ کچھ اور نہ کرتے، بہر حال ان کو کم سے کم میری خواہش تو پوری کرنی ہوگی۔

یادش بخیر! شبلی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے زیادہ ایک زندہ مصنف پر قلم آزمائی کی گنجائش نہیں، چبائے ہوئے نوالوں کا بار بار منہ میں پھیرنا خواہ وہ کتنے ہی خوش ذائقہ ہوں جدت طرازی جائز نہیں رکھتی اور چونکہ کوئی نئی بات نہیں کہہ سکوں گا اس لیے مختصراً اس قدر کافی ہے کہ شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا اور حکیمانہ انکشافات و نکتہ آرائیوں سے ایک مستقل فن بنا دیا۔

علی گڑھ کو انھوں نے چھوڑا اور ندوۃ العلمانے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے خود ان کو۔ لیکن میرا بس ہو تو شبلی کو ہندوستان سے باہر کالے کوسوں یورپ کے کسی "بیت الحکماء" (لٹریری ایکڈیمی) میں بھیج دوں جہاں ان کو اپنی غیر معمولی قابلیت کی داد بڑے بڑے علمائے مستشرقین سے ملے گی جو بلحاظ ہم فنی ان کے یاران طریقت ہیں۔ شبلی کا وسیع دائرۂ تحقیقات اہل زبان کی سی فارسی اس میں بھی ان کے لائق رشک انشا پردازی وہ صفات ہیں جو علانیہ ان کو ہم نفسوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ شعر العجم کے چوتھے حصہ میں فلسفۂ شاعری پر مختلف پہلوؤں سے جس جس طرح تنقید کا حق ادا کیا ہے "ادب الاساتذہ" کا بہتر سے بہتر مرقع ہے جس پر دنیا کی کوئی زبان فخر کر سکتی ہے۔

اُردو میں ان کے مطایبات نظم کو جو جدید پیداوار ہیں ان کے سلسلۂ کمالات سے علیحدہ کرکے دیکھیے۔ جن میں لطائف ادبی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، یہ رنگ بھی ان ہی کا حصہ ہے، شوخی کے ساتھ سنجیدگی یہ معلوم ہوتا ہے دور سے بلائیں لے رہی ہے۔

لیکن اس جامعیت کے ساتھ بھی سوال یہ ہے کہ قوم نے کہاں تک حوصلہ افزائی کی۔ کل کی بات ہے، اتفاقی واقعہ پر شبلی پر ملک کے چپہ چپہ سے لے دے شروع ہوگئی

اور اس قدر غل شور ہوا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامۂ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہے۔ جس سے کچھ دنوں کے لیے اخباری اُفق کی فضائے بسیط ایک دم سے تیرہ و تار ہوگئی۔ کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا؟ ہر گز نہیں صرف حاسدین کی کم نظری تھی۔ دلوں کی جمی ہوئی سیاہی لغزشِ قلم سے ٹپکی اور بری طرح ٹپکی۔

لیکن شرافتِ علم دیکھیے! شرر کو جو شبلی پر کبھی کبھی سخن گسترانہ چوٹیں کرتے تھے اس ناگوار واقعہ کے بعد جس کا انجام ندوہ سے مولانا کی دست کشی پر ہوا، اپنی آواز بلند کرنی پڑی۔ وہ صاف صاف کہہ گزرے کہ ندوہ میں جو کچھ دم تھا شبلی کی وجہ سے تھا اب وہ ایک جسدِ بے روح ہے۔ اسی ضمن میں مولانا کے کمالات کا شناسانہ اعتراف اور قوم کی ناسپاسی کا رونا تھا۔

"نقاد" میں "تاریخ کا معلم اول" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ ایک قاصر النظر نے اہتمام کے ساتھ "مشرق" میں اس کی تردید کی جسارت کی لیکن عامیانہ و حاسدانہ، جس میں علامہ شبلی کو ان اوصاف سے معرا کرکے دکھایا تھا جو مضمون نگار نے حسنِ عقیدت سے نہیں بلکہ خود "فلسفہ" کے ایما سے غیر فانی شبلی کی طرف منسوب کیے تھے۔

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ شبلی پر اگر کوئی قلم اٹھانا چاہے تو جی لگنے کے سامانوں میں کمی نہیں میرے خیال میں سید عبدالماجد اگر فلسفہ تاریخ سے اتنی ہی دلچسپی کا اظہار کرتے جس اہتمام سے "الکلام" پر منحرفانہ نظر ڈالی گئی تھی تو کفارۂ معصیت کے ساتھ تنقید کا حق بھی ادا ہو جاتا۔

سب سے آخر مگر در اصل سر فہرست آزاد پر میں خود کچھ لکھنا چاہتا ہوں آزاد اس پائے کے ادیب ہیں کہ ان کے دائرے کے اور خلاقینِ سخن کو ان کے آگے سر جھکانا پڑے گا۔ آزاد کی جن حیثیتوں پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ پڑ سکتی ہے وہ تحقیقاتِ السنہ کے مذاق کے ساتھ پاکیزگیٔ زبان اور آزاد کا خاص اندازِ بیان ہے جس سے ان کی نثر عموماً زرنگار معلوم ہوتی ہے۔

ایک مغربی شاعر کے خیال میں جس نے شوخی سے عالم فطرت (نیچر) پر کمال صنعت (آرٹ) کو ترجیح دی ہے۔ خوش آب موتیوں کا نشاط انگیز انتشار کے ساتھ فرش ریشمی پر بکھر جانا روانیٔ آب سے زیادہ دلکش ہے مگر اس سے زیادہ تر دلکش ہے کسی نازک خیال مصنف کی مرصع پیداوار دماغی جو حسن صوری اور معنوی کے ساتھ آمد اور بے ساختہ پن کی تصویر ہو۔ اس کے سلیس ونفیس لٹریچر کا یہ وصف اضافی کہ روکھے پھیکے مسائل کو بھی اس لطافت سے جذب کر سکے کہ کہیں سے بار طبیعت نہ ہو اور افسانہ (یعنی لائٹ ریڈنگ) کا لطف آئے، میرا خیال ہے، لائق ذکر خصائص میں سے ہے جس کی بنا پر ایک مشہور موقع پر کہا گیا تھا کہ "آزاد اردو معلیٰ کا ہیرو ہے"۔

جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا ہے اردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں۔ اور گو اس مسئلے پر ابھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہے لیکن آزاد کی ادبی فتوحات، تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا۔ جن حضرات کی نگاہیں دلی، لکھنو کے اختلافات تک محدود ہیں یا جن کی قاصر النظری میرے اس خیال کی تائید کی مانع ہو وہ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں بلاخوف تردید یہ عرض کروں کہ پروفیسر آزاد کا درجہ بحیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لیے جو فلسفۂ لٹریچر سے قطعاً بیگانہ ہے آسان نہیں ہے۔ اس لیے کسی اختلافی بحث کا چھیڑنا "گول خانے میں چوکھنٹی" سے بھی زیادہ گیا گزرا ہوگا۔

سرسید سے "معقولات" الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتے نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آغائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے، واقعات بھی انہوں نے جس قدر رکھے ہیں "قصص" (یعنی ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں "افسانۂ یاران کہن" سمجھیے۔

اس بحث کو تنقیدی مضمون میں پھیلاؤں گا۔ یہاں افتتاحی حیثیت سے کبھی قوت کا صرف کرنا منظور نہیں۔ اسی سلسلہ میں آپ دیکھیں گے کہ جدید شاعری جس کے آدم" حالی سمجھے جاتے ہیں غالباً اس کی داغ بیل سب سے پہلے آزاد نے ڈالی تھی۔ مجھ کو آزاد کے لٹریچر سے غیر معمولی دلچسپی ہے اسی لیے ذرا تفصیل کے ساتھ ان کی دل کش تصنیفات کے ان اجزا کو ابھار کر دکھاؤں گا جن کا ایک ایک حرف لٹریچر کی جان ہے۔

بہر حال ارکان خمسہ کی تجویز آپ کے سامنے ہے، اکبری نورتن کے مقابلہ میں بعض صاحبوں کو یہ تجدید پسند نہ آئے گی، لیکن مجھے افسوس ہے کہ "مصنفین کی صف اول" میں اس سے زیادہ گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔ تاہم غیر ضروری نکتہ چینی سے علاحدہ ہو کر اگر کوئی صاحب (بشرطیکہ لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں) مجھے مفید مشورہ دے سکیں تو میرا خیال ہے میں اس پر غور کرنے کے لیے ایک حد تک تیار ہوں۔

اس تجویز کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے ضرورت ہے کہ کم سے کم سو صفحے ہر مصنف کے نذر کیے جائیں۔ اس طرح پانسو صفحات کی کتاب تیار ہو جائے گی جس کا ایک طبع خاص (یعنی ایڈیشن ڈی لکس) بہتر سے بہتر کاغذ اور چھپائی کے ساتھ شائع ہو گا۔ جس میں مصنفین کے ساتھ منتقدین کی ہاف ٹون عکسی تصویریں شامل کی جائیں گی۔ اس کی تکمیل مالی امداد سے قطعاً بے نیاز ہے۔ ضرورت ہے تو ترتیب مضامین کی جس کی طرف ایک مرتبہ اور میں ان اصحاب کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جن کو فرداً فرداً میں نے نامزد کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔

○

یادگارِ غالب

(مولانا الطاف حسین حالی)

مرزا غالبؔ کے اخلاق و عادات و خیالات

وسعت اخلاق

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے وہ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے

جو خطوط انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت، غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمہ فرض عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوط کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمایشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض خالص و مخلص دوست کرتے اور وہ ان کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ ان کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تو سخت شکایت کرتے تھے۔ انھوں نے میسور کے شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے، اس نے کتاب کی رسید لکھی ہے اور قیمت دریافت کی ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔ "حرف پرسش مقدار قیمت چرا بر زبان رفت؟ ہنجار نوازش نیاز مندان بے نوا نہ ایں است۔ بے سرو سرمایہ ام نہ فرومایہ۔ سخن ورم نہ

سوداگر۔ موئینہ پوشم نہ کتاب فروش۔ بپذیرندہ عطایم نہ گیرندۂ بہا۔ ہرچہ آزادگان بشہزادگان بہ آزادی گا بخشند تبرک۔ بیع و شرا نیست۔ چون وچرا نیست۔ ہرچہ فرستادہ ام ارمغان ست ہرچہ خواہم فرستاد ارمغان خواھد بود"۔

مروت

مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے بااین ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں" جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ اشرف بوعلی قلندر کو بہ سبب کبر سن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کردی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار سے مجھے معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا"۔ باوجود اس کے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ مرزا تفتہ نے لکھ دیا تھا کہ "آپ نے بسبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی"۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ! کس ملعون نے بسبب ذوق شعر کے اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق قہر درویش بجان درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے"۔

فراخ حوصلگی

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا، سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو

روپے ماہوار ہوگئی تھی اور کھانے پہننے کا خرچ بھی کچھ ایسا بڑا نہ تھا مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے۔

غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسب معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لیے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب ان کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ ان دوستوں کے ساتھ جو گردش روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عمائد میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے اور غدر کے بعد ان کی حالت سقیم ہوگئی تھی ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا کو ملنے آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ ان سے پوچھا کہ "یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی ہے؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیں۔" انھوں نے کہا "یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے، اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔" مرزا نے کہا "جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟" پھر ادھر ادھر دیکھ کر کھونٹی سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ ان کی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "قلندری، آزادگی، ایثار و کرم کے جو دعاوی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا

نہ وہ دست گاہ کہ عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں"۔

حافظہ

جیسی مرزا کی طبیعت میں دراکی اور ذہن میں جودت اور سرعت انتقال تھی اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہیں تھا۔ ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے۔ مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے۔ جس کی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتہ میں جن لوگوں نے ان کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی باد مخالف لکھی تھی ان کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھ کر علاحدہ بھیجی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خط میں ان کو مفصل بیان کیا ہے۔

برہان قاطع پر جو کچھ انھوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکر و شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمربند میں گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم بند کر لیتے تھے۔

شعر فہمی

شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مشّاق آدمی تھے۔ کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اس کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خان مرحوم گلشن بیخار میں مرزا کی نسبت لکھتے ہیں۔ "مضامین شعری را کماحقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف پے می برد۔ و ایں فضیلتے است کہ مخصوص بعض اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس داری باین نکتہ می رسی۔ چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب است اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال شخصے کہ از ہر دو شربے یافتہ۔ و حظّے ربودہ۔ بالجملہ چنین نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ۔"

سخن سنجی

نواب ممدوح نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا آزردہ نے "دور نہیں" "حور نہیں" اس زمین میں غزل لکھی تھی۔ اس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سنا کر ان سے کہا کہ "اگرچہ بحر دوسری ہے مگر ردیف و قافیہ میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

عشق عصیان ست اگر مستور نیست
کشتۂ جرم زباں مغفور نیست

ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین میں جس میں ہماری غزل ہے اردو غزل لکھتا تو اس کا مطلع اس طرح ہوتا۔

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں
کشتۂ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں

آؤ! آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اس کے کہ قائل کا نام لیا جائے۔ اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا بھی اردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور پوچھیں کہ کون سا مطلع اچھا ہے؟

چونکہ نظیری کا مطلع اردو ترجمہ سے بہت پست ہو گیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کریں گے اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دیں گے۔ چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہنچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اردو کے دو مطلع ہیں۔ ان میں آپ محاکمہ کیجیے کہ کونسا مطلع اچھا ہے؟ اور بطور تخمین کے اول نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اس مطلع کو سن کر سر دھننے لگے، اور متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا ہے؟ اور اس کی اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ امید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملے گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اٹھے۔

کتاب فہمی

مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب ممدوح فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل، مطالعہ کر رہا تھا اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آنکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا انھوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیاں کر سکتے۔

حسن بیان اور ظرافت

مرزا کی تقریر میں ان کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اسی وجہ

سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے، حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا! تم نے کتنے روزے رکھے" عرض کیا "پیرومرشد ایک نہیں رکھا۔"

ایک دن نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے۔ اُن کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گذر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں نواب صاحب ان کو لینے کو کھڑے تھے مرزا نے ان کو دیکھ کر یہ مصرعہ پڑھا:

کہ آب چشمۂ حیواں درون تاریکی ست

جب دیوان خانے میں پہنچے تو اس کے دلان میں بہ سبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی مرزا نے وہاں یہ مصرعہ پڑھا۔

"ایں خانہ تمام آفتاب است"

ایک صحبت میں مرزا میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے انھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا "میں تو تم کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔"

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اٹھتے تھے وہ مکان کے دروازہ کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب کوٹھڑی تنگ و تاریک تھی جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھڑی میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا۔ اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔

ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھڑی میں کسی دوست کے ساتھ چوسر شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو

رمضان کے مہینہ میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہوگیا ہے۔" مرزا نے کہا "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے" الغرض مرزا کی کوئی بات لطف وظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی ان کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف وظرائف کی تیار ہو جاتی۔

خودداری

باوجودے کہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا مگر خودداری اور حفظ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے شہر کے امرا عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے وہ کبھی ان کے مکان پر نہیں جاتے تھے اور جو شخص ان کے مکان پر آتا تھا وہ بھی اس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔

ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے مکان پر آئے۔ میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب نے کہا "آپ مکان سے سیدھے نہیں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا۔ مرزا نے کہا "مجھ کو ان کا ایک آنا دینا تھا۔ اس لیے اول وہاں گیا تھا۔ وہاں سے یہاں آیا ہوں۔"

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم چیرٹ میں سوار مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا بمضمون یہ کہ "آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی کہ شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ کبھی نہ کبھی اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔" جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

خوراک

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انھوں نے کھچڑی یا شوربا نہیں کھایا۔ اخیر میں ان کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی۔ صبح اکثر شیرہ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا ان کے لیے گھر میں سے آتا تھا۔ اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالہ میں بوٹیاں اور دوسرے میں لعاب یا شوربا، ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا۔ ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی۔ ایک اور پیالی میں دو تین پیسے بھر دہی۔ اور شام کو کسی قدر شامی کباب۔ یا سیخ کے کباب۔ بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا بہت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا ''اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے۔ اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا۔''

آموں کی رغبت

فواکہ میں آم ان کو نہایت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں ان کے دوست دور دور سے ان کے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور خود اپنے بعض دوستوں سے تقاضہ کرکے آم منگواتے تھے۔ ان کے فارسی مکتوبات میں ایک خط ہے جو غالباً کلکتے کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے امام باڑہ ہگلی بندر کے متولی صاحب کو آموں کی طلب میں لکھا ہے، اس میں لکھتے ہیں۔

حسن طلب

"لختے شکم بندہ ام، و قدرے ناتواں، ہم آرائش خواں جویم، وہم آسائش جاں،

جاں خود داراں دانند کہ ایں ہر دو صفت بہ انبہ اندر ست' و اہل کلکتہ بر آنند کہ تلمر و انبہ ہگلی بندر ست'، آرے انبہ از ہگلی' و گل از گلشن' ایثار از جناب و سپاس از من، شوق می سگالد کہ تا پایان موسم دو سہ بار بخاطر ولی نعمت خواہم گذشت و آزمی نالد کہ حاشا بدیں مایہ برخورداری خورسند نخواہم گشت''۔

ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزا بھی تھے باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لد رہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟" مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "پیر و مرشد! یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے بر سر ہر دانہ بنوشتہ عیاں کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں؟" بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے ان کو آم نہیں بھاتے تھے ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب نے کہا "دیکھیے! آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا" مرزا نے کہا "بے شک گدھا نہیں کھاتا"

مرزا کی نیت آموں سے کبھی سیر نہیں ہوتی تھی۔ اہل شہر تحفتہً بھیجتے تھے خود بازار سے منگواتے تھے' باہر اور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا۔ مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔

نواب مصطفیٰ خاں ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے

مرزا سے کہا "تم بھی اپنی رائے بیان کرو"۔ مرزا نے کہا "بھئی! میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونا چاہیں۔ میٹھا ہو اور بہت ہو" سب حاضرین ہنس پڑے۔

ناؤ نوش

مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انھوں نے مقرر کرلی تھی اس سے زیادہ کبھی نہ پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے اور نشہ کی جھنجھلاہٹ میں داروغہ کو بہت برا بھلا کہتے تھے مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا۔ ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو مقدار میں بہت کم پیتے تھے دوسرے اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چناں چہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کا فرنشے کی عادت نے آخر کار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا جس کی شکایت سے ان کے تمام اردو رقعات بھرے ہوئے ہیں۔

مرزا کے خاص شاگرد اور دوست جن سے نہایت بے تکلفی تھی۔ اکثر شام کو ان کے پاس جاکر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اس وقت پر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔

ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا "بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گناہ گار کرتا ہے"۔ انھوں نے نہ مانا اور کہا "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت

دے دیجیے گا۔" مرزا نے کہا "ہاں اس کا مضائقہ نہیں" جب وہ پیر داب چکے انھوں نے اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا "بھیا کیسی اجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمھارے پیسے دابے، حساب برابر ہوا۔"

ایک روز قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ بیں بھی وہاں موجود تھا اور ان کے سامنے رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا۔ مرزا نے کہا "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں۔ میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا" پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ "نواب عبدالاحد خاں کے دسترخوان پر ان کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے مگر ان کے لیے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی۔ وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز ان کے لیے مزعفر پکا تھا۔ وہی ان کے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منہ لگا ہوا تھا جو اس وقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب اس کو کھانا دینے کے لیے خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا اور کہا حضور اور رکابی کا کیا کیجیے گا اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے۔" نواب یہ فقرہ سن کر پھڑک گئے اور وہی رکابی اس کی طرف سرکا دی۔"

ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھ کر بولے "جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے ستاروں کو دیکھو کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں؟ نہ تناسب ہے نہ انتظام ہے۔ نہ بیل ہے نہ بوٹا ہے، مگر بادشاہ خود مختار ہے کوئی دم نہیں مار سکتا۔"

ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے۔ جب تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمع دان لے کر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ انھوں نے کہا "قبلہ و کعبہ! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ میں اپنا جوتا پہن لیتا" مرزا نے کہا "میں آپ کا جوتا دکھانے شمع دان نہیں لایا بلکہ اس لیے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔"

اگرچہ شاعری کی حیثیت سے انھوں نے شراب کی جابجا تعریف کی ہے مگر اعتقاداً وہ اس کو برا جانتے تھے اور اپنے اس فعل پر سخت نادم تھے. باوجود اس کے انھوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں۔

شراب کے متعلق ان کی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں۔ایک شخص نے ان کے سامنے شراب کی بہت مذمت کی اور کہا کہ "شراب خوار کی دعا قبول نہیں ہوتی" مرزا نے کہا "بھائی جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہیے جس کے لیے دعا مانگے"۔

ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔

بے مے نکند در کف من خامہ روائی
سردست ہوا، آتش بے دود کجائی

"میر مہدی! صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں۔ ہاتھ تاپتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ وپے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیٔ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب، ہائے غضب" یہ خط غدر کے بعد اس زمانے میں لکھا ہے جب پنشن وغیرہ سب بند ہے اور بسبب عسرت وتنگدستی کچھ پیتے پلاتے نہیں ہیں۔

میر مہدی مجروح نے جے پور سے خط بھیجا ہے اور وہاں جو کسی تقریب میں کئی سو من مصری کا شربت مہمانوں کے لیے کیا گیا تھا اس کا ذکر لکھا ہے۔اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں "میر احمد حسین و مرزا قربان بیگ نامہٴ شمارا خواندند و بذوق شربت ہفت صد من نبات ہر دو را آب، در دہن گشت سخن از بادۂ ناب نبود، ورنہ مرا نیز دل از جا رفتے"

مرزا نے غزلیات وقصائد و قطعات ورباعیات میں شراب کے متعلق جس قدر مضمون باندھے ہیں وہ خواجہ حافظ اور عمر خیام سے کم نہ ہونگے۔ یہاں ایک شعر اردو غزل کا اور ایک فارسی غزل کا اور ایک فارسی رباعی لکھی جاتی ہے۔

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں
خجلت نگر کہ در حسنا تم نیافتند   جز روزۂ درست بہ صہبا کشودہ

رباعی

غالب بہ سخن گرچہ کست ہم سر نیست
از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز آنگہ بسیار
ایں بادہ فروش ساقیٔ کوثر نیست

اسلام کا یقین

مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے مگر جیسا کہ کہا گیا ہے، "من احب شیأ اکثر ذکرہ" توحید وجودی ان کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو انھوں نے جس قدر اصناف سخن میں بیان کیا۔ مرزا کے حق میں اگر اور کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے۔

امید ہست کہ بے گانگیٔ عرفی را
بدوستی سخن ہائے آشنا بخشند

انھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں، ایک توحید وجودی دوسرے نبی اور اہل بیت کی محبت اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔
اگرچہ شاعر کے کلام سے اس کے عقائد پر استدلال نہیں ہو سکتا مگر جو بات دل سے نکلتی ہے وہ چھپی نہیں رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر حکمائے اسلام نے نعیم جسمانی سے انکار کیا ہے مرزا بھی اس کے قائل نہ تھے چنانچہ انھوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ انداز میں

متعدد جگہ ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

گردیدن زاہداں بہ جنت گستاخ
واں دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی ز روے تشبیہ
ماند بہ بہائم و علف زار فراخ

مرزا باوجودیکہ احکام ظاہری کے بہت کم پابند تھے لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا۔ ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعہ پر نہایت افسوس کرتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے؟ مگر چوں کہ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی جب کوئی گرم فقرہ سوجھ جاتا تھا پھر ان سے بغیر کہے نہیں رہا جاتا خواہ اس میں ان کو کوئی کافر سمجھے یا رند مشرب کہے یا بدمذہب جانے۔

غدر کے بعد جب پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوئی تھی۔ پنڈت موتی لال میر منشی لفٹنٹ پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا "تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر، اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار، پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا؟"

اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسول خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔

ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں یہ کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی۔ چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ ان میں سے ایک رباعی بہت لطیف ہے مجھ

کو یاد رہ گئی ہے جو یہاں لکھی جاتی ہے:

شوخیٔ بیان

رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

دہریت اور تصوف میں جو بُعدِ بعید ہے وہ ظاہر ہے۔ دہری خدا کے وجود ہی کا قائل نہیں اور صوفی صرف خدا ہی کو موجود جانتا ہے اور ماسوا کو ہیچ سمجھتا ہے۔ پس صوفی دہری کیوں کر ہو سکتا ہے؟ چوتھے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ ماوراء النہری یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سنی ہونے میں ضرب المثل ہے۔ یہاں تک کہ شیعہ ان کو ناصبی اور خارجی سمجھتے ہیں۔ چوں کہ مرزا کی اصل ماوراء النہر سے تھی اس لیے کہتے ہیں کہ ماوراء النہری رافضی یا شیعی کیوں کر ہو سکتا ہے؟

جو لوگ مرزا کی طرزِ مزاج اور طرزِ کلام سے نا آشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کے حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لیے اپنا مذہب غلط بیان کیا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رباعیاں صرف بادشاہ کو خوش کرنے اور اہلِ دربار کے ہنسانے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ کیوں کہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم از کم تفضیلی نہ جانتا ہو۔ مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کے خوش کرنے کو اس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے۔

ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا۔ مرزا نے اسی وقت یہ شعر انشا کر کے پڑھا:

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

رمضان کا مہینہ تھا۔ ایک سنی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے۔ عصر کا وقت تھا مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے تعجب سے کہا۔ "کیا جناب کا روزہ نہیں ہے؟ مرزا نے کہا "سنی مسلمان ہوں چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں"۔

ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے ان کا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا۔ مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاک شفا دی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہو گئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائے گی تو حضرت عباس کی درگاہ میں جو لکھنؤ میں ہے علم چڑھاؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے لکھنؤ جا کر بادشاہ کو عرض داشت بھیجی کہ میرا مقدور نذرانہ ادا کرنے کا نہیں ہے حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور انھوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور اُمراء علما سب شریک تھے اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا۔

اس واقعہ کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہو گئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا۔ اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے۔ اور بادشاہ کے حکم سے مرزا نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام غالباً "دفع الباطل" رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔

اس مثنوی میں مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں۔

سلامتی طبع

مرزا کی طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی۔ باوجودیکہ تیزی ذہن اور سلامتی طبع دونوں ایک جگہ بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ مرزا میں یہ دونوں باتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ اسی سلامتی طبع کا اقتضا تھا کہ ابتدا سے مشق سخن میں جو ٹیڑھا راستہ اُنھوں نے اختیار کیا تھا بغیر اس کے کہ کوئی اُستاد رہبری کرے، جس قدر عقل و تمیز بڑھتی گئی اُسی قدر آہستہ آہستہ اس سے انحراف ہوتا گیا اور آخر کار اساتذۂ مسلم الثبوت کی روش مستقیم پر آ رہے۔

مرزا ازرہ عجز و انکسار کہا کرتے تھے کہ قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں افتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں مگر مدح و ستائش میں مجھ سے ان کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔ مرزا کا یہ کہنا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ جو زور ان کی تشبیہوں میں پایا جاتا ہے وہ مدح میں آکر باقی نہیں رہتا۔ مگر ہم اس کو ان کے نقص شاعری پر محمول نہیں کرتے، بلکہ غایت درجے کی سلامت ذہن و استقامت طبع کی دلیل جانتے ہیں۔ جھوٹی اور بے اصل باتوں کو چمکانا، اور زمین آسمان کے قلابے ملانا اور مبالغہ و اغراق کا طوفان اٹھانا فی الحقیقت شاعر کا کمال نہیں بلکہ جس قدر اس کی طبیعت ان باتوں سے ابا کرتی ہے اسی قدر جاننا چاہیے کہ وہ شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرزا کی ساری عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گزری کیونکہ ضرورت انسان سے سب کچھ کراتی ہے مگر فی الحقیقت جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے ان کو بھٹئی کرنے کا طریقہ جیسا کہ چاہیے ویسا نہیں آتا تھا۔

دادِ سخن

ہماری سوسائٹی میں جو ایک عام دستور ہے کہ جو شخص اپنا کلام سناتا ہے اس کے ہر شعر پر خواہ اچھا ہو خواہ برا برابر تحسین و آفرین کی جاتی ہے اور اچھے برے شعر میں

تمیز نہیں کی باقی۔ مرزا کی عادت بالکل اس کے برخلاف تھی۔ کوئی کیسا ہی معزز و محترم آدمی ہو جب تک اس کا کوئی شعر فی الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا وہ ہرگز اس کی تعریف نہ کرتے تھے۔ اخیر عمر میں تو ان کا ثقل سماعت انتہا کو پہنچ گیا تھا، مگر پہلے ایسا حال نہ تھا۔ وہ کسی قدر اونچی آواز سے بات چیت اور شعر و سخن سن لیتے تھے۔ مگر جب تک کوئی شعر ان کے دل میں نہ چبھتا تھا ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ ان کے بعض معاصران اس بات سے آزردہ رہتے تھے اور اسی لیے ان کی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے مگر مرزا باوجود سے کہ ان کی طبیعت نہایت صلح جو واقع ہوئی تھی شعر کی داد دینے کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا تھا اس کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ لیکن جو شعر ان کے دل میں چبھ جاتا تھا اس کی تعریف بھی ایسی کرتے تھے جو مبالغہ کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ذوق سخن ان کو بے اختیار کر دیتا تھا۔

انصاف

شیخ ابراہیم ذوق جن کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو ان سے چشمک تھی ایک روز جب کہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے منشی غلام علی خاں مرحوم نے ان کا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سنانے کو پڑھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خاں مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے کہا "بھیا تم نے کیا پڑھا" میں نے پھر وہ شعر پڑھا" پوچھا کس کا شعر ہے"؟ میں نے کہا "ذوق کا" یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اردو خطوں میں اس شعر کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔

اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سنا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اس کی بہت تعریف کی اور کہا "کاش! مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا" اس شعر کو بھی انھوں نے اپنے متعدد خطوط میں نقل کیا ہے اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے۔

دکھلائیں گے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے۔

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ ان کی تعریف میں شاید ان کا دل بڑھانے کو حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ انھوں نے اخیر عمر میں اپنے شاگرد کی غزل دیکھ کر اس کی بے انتہا تعریف کی اور کہا کہ "اگر میں اب رشک کرنے کے قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد"

حق پسندی

مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا یا کوئی عمدہ تصرف ان کے شعر میں کرتا تھا۔ اس کو فوراً تسلیم کر لیتے تھے اور شعر کو بدل ڈالتے تھے۔ مثنوی "درد داغ" میں ان کا ایک مصرع تھا:

خوک شد پنجہ زدن ساز کرد

جب مرزا نے یہ مثنوی تحفۃً ناطق مکرانی کو بھیجی تو اس نے مرزا کو لکھا "خوک سم ندارد نہ

پنجا" اگر نزدیک اساتذہ اطلاق سم و پنجہ بیک محل روا باشد اعلام باید فرمود"۔ مرزا نے اس کے جواب میں صاف لکھ بھیجا کہ اگر کلیات فارسی کے چھپنے سے پہلے آپ کا خط پہنچ جاتا تو میں اس لفظ کو بدل ڈالتا اور مصرعے کو یوں بنا دیتا:

خوک شد، بد نفسی ساز کرد

چنانچہ جب مرزا کا کلام دوسری بار چھپا تو انھوں نے یہ مصرع اسی طرح بنا دیا۔ مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے۔

ہم چنان در تتق غیب ثبوتے دارند
بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیان

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے ثبوتے کی جگہ نمودے لکھا تھا۔ مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیان ثابتہ کے لیے نمود کا لفظ نامناسب ہے۔ اس کی جگہ ثبوت بنا دو۔ چنانچہ طبع ثانی میں انھوں نے بجائے نمود کے ثبوت بنا دیا ہے۔ اسی طرح ایک قصیدے کے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے۔

عید اضحیٰ ببر آغاز زمستان آمد

مرزا نے اول عید قرباں لکھا تھا۔ پھر نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے کہنے ہی سے عید اضحیٰ بنا دیا گیا۔ حالانکہ نواب موصوف خود مرزا سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور مومن خاں مرحوم کے بعد ہمیشہ انھیں کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

ان باتوں سے مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں ہیں بلکہ انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت اور وہ ملکہ جس کے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔ جن لوگوں میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی ان کا اپنے فن میں ترقی کرنا ناممکن ہے۔

راست گفتاری

حالانکہ ایشیائی شاعری، جس کی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے۔

مرزا کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی باوجود اس کے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہجہ تھے۔ اسی لیے جو شخص ان کے وعدہ اور اقرار کا یقین نہ کرتا تھا اس سے نہایت ناراض ہوتے تھے۔ تفضل حسین خاں مرحوم خلف دیوان فضل اللہ خاں سے مرزا نے اپنا دیوان مانگا ہے اور اقرار کیا ہے کہ میں اس کو دیکھ کر واپس بھیج دوں گا انہوں نے دینے سے انکار کیا ہے۔ ان کے انکار کے جواب میں لکھتے ہیں " کیوں صاحب؟ یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی استادی ہونا سب پر پانی پھر گیا۔ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے؟ میرا کلام! اخرید آٹھ دس روپے کی۔ سو وہ بھی یہ میں نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو۔ تم کو مبارک رہے۔ مجھ مستعار دو۔ میں اس کو دیکھ لوں، جو میرے پاس نہیں ہے اس کی نقل کر لوں، پھر تم کو واپس بھیج دوں۔ اس طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو۔ میرا اعتبار نہیں یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو۔ واللہ باللہ میں اس سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے بھیج دوں گا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تم پر آفرین۔"

اسی طرح ایک خط میں نواب علاؤ الدین خاں کو لکھتے ہیں۔ " بدست مرگ وے بد تر از گمان تو نیست۔ مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا مگر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کونسی رباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے۔ اب کے تو مقرر بھیجے گا بھائی! قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار وید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، اوستا کی قسم، گرو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں۔ بر ہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود۔"

مرزا کی راست بازی کا سبب یہ تھا کہ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے۔ جو

دل میں تھا وہی زبان پر تھا جو خلوت میں کرتے تھے وہ جلوت میں کرتے تھے۔ پس اگر ان میں کوئی عیب تھا تو وہی کہ جس کو ہر کس و ناکس جانتا تھا۔ مخفی عیبوں سے وہ پاک تھے۔

موت کی آرزو

مرزا یا تو اس وجہ سے کہ ان کی زندگی فی الواقع مصائب اور سختیوں میں گزری تھی اور یا اس لیے کہ ان پر ناملایم حالتوں کا بہت زیادہ اثر ہوتا تھا آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے اور یہ خیال کرتے کہ اس سال ضرور مر جاؤں گا۔

۱۲۷۷ھ میں انھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ یہ کہی کہ "غالب مرد" اس سے پہلے کئی مادے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر تخلص جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے۔ ان سے مرزا صاحب نے مادے کا ذکر کیا۔" انھوں نے کہا "حضرت انشاءاللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا" مرزا نے کہا "دیکھو صاحب تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو' اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا تو سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔"

ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی' میر مہدی حسین مجروح نے دریافت کیا کہ "حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں" بھئی! کیسی وبا! جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی تو تف بریں وبا۔"

اسی قسم کی اور بہت سی باتیں اور حکایتیں ان سے منقول ہیں۔ جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزومند تھے۔

مرنے سے کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی چھ چھ سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تھی۔ تو پردہ ہو جاتا تھا۔ آپ بغیر استعانت کسی نوکر چاکر کے

کپڑے اتار کر بیٹھے ہی بیٹھے کھسکتے ہوئے چوکی تک پہنچتے تھے۔ پلنگ پر سے چوکی تک جانا، چوکی پر چڑھنا، چوکی پر دیر تک بیٹھے رہنا اور پھر چوکی سے اتر کر پلنگ تک آنا، ایک بڑی منزل طے کرنے کے برابر تھا۔ مگر خطوط کے جواب اس حالت میں بھی برابر یا خود پلنگ پر پڑے پڑے لکھتے تھے یا کسی دوسرے آدمی کو بتاتے جاتے تھے، وہ لکھتا جاتا تھا۔

مضامینِ شرر

(عبدالحلیم شرر)

مٹیا برج کے حالات

انگریزوں نے اُن (واجد علی شاہ) کے رہنے کو دریائے بھاگرتی کے کنارے چند کوٹھیاں دیں اور بادشاہ وہیں بیٹھ کر اپنے نُورِ نظر کے غریب الوطن قافلے کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگنے لگے[۱] بس اسی وقت سے مٹیا برج کا دور شروع ہوا۔ اس لئے کہ جس خطۂ زمین پر بادشاہ کا قیام تھا وہ اسی نام سے مشہور تھا اور یہی مقام ہے جو سلطانِ عالم کے ورود کی برکت سے چند روز میں ایک چھوٹا سا شہر بن گیا۔ جس کے باغ اور عمارت حیرت روزگار تھے۔

پہلے بادشاہ کے یہاں پیش پیش ایک کشمیری الاصل بزرگ منشی صفدر تھے۔ جن کو شاید محمود الدولہ کا خطاب عطا ہوا تھا اور ان کے اعزا و مخصوص احباب کارپردازانِ دربار قرار پائے۔ جن میں سماع الدولہ اور مرزا احمد بیگ (جن کو شاید انتظام الدولہ یا منتظم الدولہ کا خطاب تھا) زیادہ پیش پیش تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ابتداً یہاں کے قیام میں بھی بادشاہ ہر معاملہ میں غور و پرداخت کرتے ہیں اور بیدار مغزی سے حسابات کی جانچ پڑتال کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر منشی صفدر گھبرائے کہ یہی حال رہا تو مجھے فائدہ اٹھانے کا کیسے موقع ملے گا؟ اور دو ایک مغنیوں کو پیش کر کے طبلہ اور طنبورہ لا کے

---

[۱] ۔ معزولی کے بعد واجد علی شاہ لکھنؤ سے کلکتے چلے گئے تھے اور ان کا ارادہ لندن جاکر دربارِ انگلستان سے فریاد کرنے کا تھا۔ مگر کلکتہ پہنچ کر بیمار ہو گئے اور اپنی والدہ، ولی عہد اور ایک مختارِ عام کو لندن بھیج دیا تھا۔ (مرتب)۔

سامنے رکھ دیا۔ ان کی یہ تدبیر پوری پڑی اور "سرود بہ مستان یاد دھانیدن" کا معاملہ ہوگیا۔

چند روز کے بعد منشی صفدر مر گئے اور ان کے آوردوں نے بادشاہ کو ہر طرح ٹوٹا جانوروں کا شوق تھا اور رمنے میں بہت سے جانور جمع ہو گئے تھے۔ ان کی دانہ خوری سماع الدولہ کے سپرد تھی۔ انھوں نے ایسی لاپروائی کی کہ تین روز تک جانوروں کو دانہ نہ ملا۔

اور بادشاہ بوچہ پر سوار سیر کو گئے تو سب جانور ہر طرف سے دوڑ کے بوچے کے گرد شور کرنے لگے۔ بادشاہ نے سبب پوچھا تو کسی جانور باز نے عرض کیا کہ "جہاں پناہ ان کو تین دن سے دانہ نہیں ملا ہے" بادشاہ نے فوراً دانہ منگوا کر اپنے سامنے ڈلوا دیا۔ سب جانور اس پر بیتابی سے ٹوٹ پڑے۔

اسی وقت سے بادشاہ نے جانور خانہ ایک نئے شخص مرزا رمضان بیگ کے سپرد کیا جو لکھنؤ کے ایک ہندو رئیس رائے دلارام کے بیٹے تھے۔ رمضان بیگ کو منشی السلطان بہادر کا خطاب تھا۔ تمام اہل قلم اور محرر چاہے کسی دفتر میں کام کرتے ہوں انھیں کے ماتحت تھے اور ان کی برطرفی بحالی ان کے سپرد تھی۔ شاہی گلو خانہ، رسالہ خسروی اور تہنیت منزل کوٹھی بھی ان کے سپرد تھی۔ وہ سنی المذہب، بڑے دیندار روزے نماز کے پابند اور بڑے لسان و بذلہ سنج تھے۔ بادشاہ کو ان کی باتوں میں بڑا مزہ آتا۔ رات کو گاڑی پر سوار ہو کر اپنی کوٹھیوں کے باغوں میں گشت لگاتے تو منشی السلطان کو خواصی میں بٹھا لیتے۔

شاہی گاڑی بھی خاص وضع کی تھی، اونچا کوچ بکس آداب شہریاری کے خلاف تھا۔ اس لئے کہ گاڑی میں کوچ مین جوڑی کے داہنی طرف والے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھتا اور دونوں گھوڑوں کی راس اس کے ہاتھ میں رہتی۔ گاڑی ہنکانے کی اس وضع کو "پٹنیز" کہتے تھے۔ گاڑی میں پانوں لٹکانے کی جگہ نہ ہوتی اور ہوتی تو اس کے اندر کوئی باکس رکھ کے اور اس پر گدا ڈال کے اندر کی زمین فینس کی طرح برابر

کردی جاتی جس پر تکیہ لگا کر بیٹھتے یا لیٹ جاتے۔ آگے پیچھے دونوں جانب دو گاڑی سے الگ اور اس سے متعلق جگہیں رہتیں۔ آگے کی جانب بادشاہ کی طرف رخ کر کے حقہ بردار خادم پیچوان یا حقہ لیے بیٹھا رہتا اور پیچھے جو خواصی کی جگہ کہلاتی اس میں مصاحبین یا معزز عہدہ داروں میں سے کوئی شخص حسب الحکم بیٹھ جاتا اس سے برابر باتیں کرتے جاتے اسد منزل، مرصع منزل اور نور منزل وغیرہ کے باغوں کے گرد سڑکوں کا ایک بڑا چکر تھا جس کا پھیلاؤ تین میل سے کم نہ ہوگا۔ معمولاً اسی چکر میں گاڑی گشت کرتی رہتی تھی اور اکثر دس بجے کے بعد بادشاہ سلطان خانے کے اندرونی پھاٹک میں اتر پڑتے۔

مگر یہ گاڑی کی سواری اسی چکر کے لیے مخصوص تھی۔ یا اس وقت کے لیے جب کبھی کلکتہ یا دور کی مسافت پر جاتے۔ یوں کوٹھیوں کے اندر دن کو جب سیر کو نکلتے تو بوچے میں سوار ہوتے۔ بوچے کی صورت بالکل ادھے گاڑی کی سی ہوتی جس میں بجائے پہیوں کے آگے پیچھے دو دو فینس کے ایسے ڈنڈے لگے رہتے ان ڈنڈوں میں سے ہر ایک کو تین تین چار چار کہار کندھوں پر اٹھاتے اور اس میں کوئی اور نہ سوار ہو سکتا۔ تمام امرائے دولت اور معزز مصاحبین پا پیادہ ہمراہ ہوتے۔

وہ لوگ جن کو دولہ کا خطاب ہوتا اپنی شاہی اعزازی ٹوپیاں پہنے ہوتے، یہ ٹوپی ایک ایسی مقوے کی منڈیل تھی جو پیشانی پر گولائی کے ساتھ اونچی ہوتی اکثر اس پر کارچوبی کام بنا ہوتا اور اس کے اوپر کی لگر پر اندر کی جانب سے ایک باریک کپڑے کا جھولا لٹکا رہتا اور وہ پیچھے گردن تک لٹکا رہتا۔ ان ٹوپیوں کو عوام "جھولا" کہتے۔ مگر بادشاہ نے اس کا نام "عالم پسند" رکھا تھا۔ جو یا تو اپنے معنوں کے لحاظ سے قرار دیا گیا تھا یعنی سارے عالم کو پسند ہے اور یا بادشاہ کی پہلی محترم ملکہ نواب خاص محل کی پسند ہو۔ اس لیے کہ ان کا تخلص عالم تھا۔ وہ اچھی شاعرہ تھیں۔ ان کا دیوان چھپ چکا تھا۔ اور اس کی اکثر غزلیں عوام کی زبان پر تھیں۔

دیگر مصاحبین و اہل کار جن میں سے اکثر کارخانوں کے داروغہ تھے، شملہ پہنے رہتے شملہ ایک مصنوعی پگڑی تھی۔ جس میں شالی یا ریشمی کپڑے کی گول بتیاں بنا کر ایک خاص

وضع سے پلیٹ کے ٹانک دی جاتیں اور سر کے چاروں طرف چھجہ سابن جاتا یہ شملے بھی صرف وہی لوگ پہن سکتے جن کو دربار شاہی سے عطا ہوتے باقی اور سب لوگوں کے لیے لازم تھا کہ سر پر پگڑی باندھ لیں اور اگر پگڑی نہ ہوئی تو معمول تھا کہ بادشاہ کے اعزاز میں لوگ ٹوپیاں اُتار کے برہنہ سر بادشاہ کے سامنے آتے۔

خود بادشاہ کی وضع یہ تھی کہ بڑے بڑے بال تھے جن کا پیچھے کی طرف جوڑا باندھ لیتے۔ بڑی بڑی کھڑی مونچھیں اور منڈی ہوئی ڈاڑھی۔ چندیا پر ایک چھوٹی سی نکے دار مسالے کی بھاری ٹوپی۔ گلے میں جامدانی یا ململ کا چست انگرکھا۔ اس کے نیچے نہ کرتہ ہوتا نہ شلوکہ۔ بائیں جانب کی چھاتی کھلی رہتی۔ پانوں میں پرانی وضع کا عرض کے ڈھیلے پائنچوں والا ابر کا پاجامہ۔ جاڑوں میں کوئی شالی رومال کندھوں پر ہوتا۔ لیکن محلات اور باغات شاہی سے باہر نکلتے تو سر پر کوئی شالی پھینٹا سا لپیٹ لیتے۔ اس کے ساتھ سچے کام کا گھیتلا جوتا پہنتے۔ ماہ مبارک رمضان میں چوں کہ پابندی سے روزے رکھتے اس لیے کبھی کبھی سہ پہر کو اپنی گاڑی پر سوار میونسپلٹی کی سڑک پر نکل جاتے اور معمول تھا کہ مٹیا برج سے خضر پور اور دھرم تلہ ہوتے ہوئے سیدھے چیت پور روڈ تک چلے جاتے اسی میں ایک بار کا یہ واقعہ کلکتہ میں مشہور ہے کہ قلعہ کے میدان سے گزرتے ہوئے عجائب خانہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اشارہ ہوتے ہی گاڑی میوزیم کے دروازہ پر جا کھڑی ہوئی۔ مگر شام ہو چکی تھی اور عجائب خانہ بند تھا اور اس کا انگریز مہتمم اسی کے کوٹھے پر تھا۔ اس نے جو اوپر سے دیکھا تو فوراً حاضر ہو کے ادب سے استقبال کیا۔ جھٹ پٹ روشنی کا انتظام کر کے بادشاہ کو سیر کرائی جس سے نہایت محظوظ ہوئے اور اپنی گاڑی جس پر گئے تھے مع گھوڑوں اور ساز و یراق سے اسے عطا کر دی۔ مگر یہ واقعہ میرے سامنے کا نہیں ہے۔

سنہ ۱۸۷۱ء کا واقعہ ہے کہ گورنر جنرل بہادر لارڈ میو نے جو ہندوستان کے حال پر بڑے مہربان تھے بادشاہ سے ملنا چاہا۔ مٹیا برج میں مشہور تھا کہ پہلے وہ خود ہی بادشاہ سے ملنے کو آئے اور بادشاہ ان سے مل کر خوش ہوئے۔ دوسرے دن بادشاہ ان

کی بازدید کی ملاقات کو گورنمنٹ ہاؤس میں تشریف لے گئے۔ وہاں تخت گاہ کے کمرے میں لارڈ میو نے پہلے بادشاہ کے برابر کرسی پر بیٹھ کر ان سے باتیں کیں اور تھوڑی دیر کے بعد خدا جانے کیا دل میں آیا کہ اپنی کرسی سے اٹھ کر شہ نشین کی اونچی صدر کرسی پر جا بیٹھے۔ اور بادشاہ کو وہیں نیچے رہنے دیا۔ بادشاہ کو اس میں اپنی سبکی نظر آئی۔ بے ساختہ اُٹھ کر بغیر رخصت ہوئے واپس چلے آئے اور اس کے بعد سے پھر کبھی کسی انگریز سے نہ ملے۔ گھر پہنچے تو کسی مزاج داں مصاحب نے عرض کیا "جہاں پناہ ظل سبحانی بغیر لارڈ صاحب سے رخصت ہوئے کیوں چلے آئے۔ فرمایا میں کس سے رخصت ہوتا؟ میں نے تو دیکھا کہ اس اونچی صدر کی کرسی پر بجائے زندہ آدمی کے ایک لاش رکھی ہے" اتفاق کی بات ہے کہ چند ہی مہینے کے بعد لارڈ میو دورے پر تشریف لے گئے تو جزائر انڈیمان میں شیر علی کے ہاتھ سے مارڈالے گئے۔

اس کے تین سال بعد پرنس آف ویلز بہادر (جو بعد کو تخت نشین ہو کر کنگ ایڈورڈ ہفتم کے نام سے مشہور ہوئے) ہندوستان کی سیر کو تشریف لائے اور کلکتہ میں ان کا بڑا بھاری دربار منعقد ہوا جس میں شریک ہونے کے لیے دور دور کے امرا اور والیان ملک آئے تھے۔ کوششیں کی گئیں اور وزیر السلطان نواب امیر علی خاں بہادر نے کوئی تدبیر اٹھا نہ رکھی کہ بادشاہ کو بھی اس دربار میں لے جائیں مگر بادشاہ نے جانے سے قطعاً انکار کر دیا۔ ہزار اصرار ہوا مگر نہ جانا تھا نہ گئے اور یہ نتیجہ اسی بے عنوانی کا تھا جو لارڈ میو کی ملاقات میں ظاہر ہو چکی تھی۔

اس موقعہ کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ پرانے مہاراجہ بنارس جنہوں نے بادشاہ کو کلکتہ جاتے وقت اپنا مہمان کیا تھا اور حق عقیدت ادا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ پرنس آف ویلز کے دربار میں شریک ہونے کے لیے کلکتے میں آئے وہاں وہ وزیر السلطان نواب امیر علی خاں سے ملے ان کو بادشاہ کے ملاحظے میں پیش کرنے کے لئے اپنی ایک عرضداشت دی اور زبانی کہا "میں اپنی حقیقی سرکار جہاں پناہ ہی کو سمجھتا ہوں۔ لہذا مجھے جتنی مسرت ان کی باریابی میں ہوگی اور کسی بات میں

نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ میرے پاس جو قیمتی جواہرات بادشاہوں کے قابل ہیں، چاہتا ہوں انہیں بادشاہ کی نذر کروں"۔ وزیر السلطان نے ان سے ملا دینے کا وعدہ کر لیا اور ان کی عرضداشت جس میں اسی قسم کے خیالات عرض کئے گئے تھے جیسا کہ مہاراجہ نے نواب صاحب سے زبانی کہے تھے ملاحظہ میں بھیج دی۔ پھر خود حاضر ہو کر عرض کیا کہ مہاراجہ کو باریابی کی بڑی تمنا ہے اور ان جواہرات کا لالچ دلایا جن کے نذر کرنے کا مہاراجہ نے زبانی وعدہ کیا تھا۔ بادشاہ نے ہوں ہاں کر دی۔ اور وزیر السلطان یہ سمجھ کر کہ بادشاہ قبول کر لیں گے واپس آئے مگر جب مہاراجہ کی وہ عرضداشت دستخط ہو کر واپس آئی تو اس کی پیشانی پر لکھا تھا "حسب دستور سابق وزیر السلطان بہادر ملاقات نمایہ" شاہی میں معمول تھا کہ باہر کے راجہ مہاراجہ اور تعلقدار جو ملنے کو آتے انہیں صرف وزیر السلطنت کی باریابی نصیب ہوتی۔ اسی بنا پر بادشاہ نے عرضداشت پر یہ حکم لکھا۔ دیکھتے ہی وزیر السلطان کے ہوش اڑ گئے۔ اور دوسرے روز جا کر عرض کیا کہ" جہاں پناہ نے مہاراجہ کی بڑی دلشکنی فرمائی" ارشاد ہوا "وزیر السلطان بہادر مہاراجہ بنارس کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں۔ اور میں اس سے ضرور ملتا۔ مگر کہتے ہو کہ وہ کچھ جواہرات نذر کرنا چاہتا ہے اب خیال کرو کہ اگر میں اس کی نذر لوں تو ضروری ہے کہ اس سے زیادہ قیمت کا خلعت بھی اسے دوں۔ مگر ہمارے پاس کیا رکھا ہے جو اسے دیں۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ اس کی ملاقات کو ایک اچھے عنوان سے ٹال دیا جائے"۔

بادشاہ نہایت ہی متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ وضع میں سادگی اور باتوں میں نہایت بھولے پن کے ساتھ عجیب قسم کی دلکشی تھی جس سے دو باتیں کیں گرویدہ ہو گیا۔ کبھی کسی اعلیٰ و ادنیٰ ملازم ادنیٰ طبقے کے نوکر چاکر خادم یا خادمہ کو نہ گالی دی نہ برا بھلا کہا۔ فحش اور سخت الفاظ ان کی زبان ہی پر نہ تھے۔ جس سے ملتے ایسی بے تکلفی سے باتیں کرتے کہ اس کا دل کھنچنے لگتا اور بجائے ہیبت و رعب کے اس میں محبت و جاں بازی کے جذبات پیدا ہو جاتے، اس کی ہمت بڑھتی حوصلہ زیادہ ہوتا۔

جس کسی سے ناراض ہوتے چپ ہو جاتے اور کبھی عجیب انداز سے ادب آموزی فرماتے۔

وزیر السلطان نواب امیر علی خاں کی رسائی ان کے دربار میں اس طریقے سے ہوئی تھی کہ نواب صاحب کلکتہ ہائی کورٹ کے پرانے زمانے کے اردو داں وکیل تھے۔ بادشاہ کے ساتھ جب محمود الدولہ اور ان کے اعزہ نے بدسلوکی کی اور اُلٹے بادشاہ پر دعوے دائر کر دیے تو جواب دہی کے لیے بادشاہ کے وکیل مقرر ہوئے وہ بار بار حاضر ہو کر مقدمہ واقعات عرض کرتے اور بادشاہ دلچسپی سے سنتے۔ جب مقدمہ ہارا اور بادشاہ پر ڈگری ہو گئی تو وزیر السلطان نے حاضر ہو کر صفائی سے کہہ دیا کہ مقدمہ تو ہار گیا اور جہاں پناہ پر ڈگری ہو گئی" سنتے ہی بادشاہ سناٹے میں آگئے ایک لمحے کو خاموش رہے۔ پھر فرمایا" وزیر السلطان تم کسی معزز دربار میں نہیں رہے ہو، ہم بادشاہوں کے کان ہارنے اور نامراد رہنے کے الفاظ سے ناآشنا ہوتے ہیں لہذا ہمارے سامنے کبھی کوئی نہیں کہتا کہ آپ ہار گئے یا ناکام رہے۔ نامرادی کے واقعات پیش بھی آتے ہیں تو لوگ خاموشی سے ٹالتے رہتے اور آخر میں ہم خود ہی سمجھ جاتے ہیں کہ اس مقصد میں ناکام رہے مگر تم ان آداب کو کیا جانو لہذا معذور اور معافی کے قابل ہو"۔

خود میرے والد بزرگوار کا واقعہ ہے کہ وہ ذوالفقار الدولہ بہار کی پیشی میں خوش نویس تھے۔ بادشاہ کو ایک خبر لگی کہ اسد باغ میں مالیوں کے جتنے اسم ہیں ان میں سے تھوڑوں ہی پر مالی مقرر ہیں باقی فرضی نام ہیں۔ تنخواہ فرضی آدمی دکھا کر لی جاتی ہے۔ نہایت برہمی کے ساتھ پیدل برآمد ہوئے اور والد کو حکم دیا کہ" برآورد لاؤ" اور ساتھ ہی باغ مذکور کے تمام مالیوں کو حاضری کا حکم ہوا۔ جب سب جمع ہو گئے تو ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور والد سے فرمایا" دیکھو خدا کو حاضر و ناظر جان کے سچ سچ پڑھنا۔ برآورد میں سے اسد باغ کے مالیوں کی فہرست نکال کے ایک ایک کا نام پکارو" اور مالیوں کو حکم ہوا کہ جس کا نام پکارا جائے سامنے آکے

دوسری طرف چلا جائے۔ سرآورد اُن دنوں کسی کتاب یا رجسٹر کی صورت میں نہ ہوتی' بلکہ مکتوب کی طرح بیسیوں بند نیچے اوپر جڑے ہوتے۔ والد اسد باغ کی سرآورد نکال رہے تھے کہ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور ان کے بند ہاتھ سے چھوٹ کے اڑنے لگے۔ والد ان کے روکنے کے لیے بیٹھ گئے اور سرآورد کو سمیٹ کے مرتب کر لیا۔ جب وہ مرتب ہو گئی تو بادشاہ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا "سنو بادشاہوں کے سامنے بیٹھتے نہیں۔" وہ کھڑے ہو کر ادب آموزی کا آداب بجا لائے اور جائزہ ہونے لگا۔

اس روایت کے بیان کرنے سے میرا صرف یہ مقصد تھا کہ واجد علی شاہ چاہے کیسی ہی خلاف ادب اور ان کے مزاج کے خلاف حرکت کسی سے سرزد ہو جائے وہ اپنی زبان خراب نہ کرتے اور بجائے درشتی کے فہمائش کر دیا کرتے۔

کبھی یہ بھی نہیں سنا گیا کہ انہوں نے کسی کو اپنے ہاتھ سے مارا پیٹا ہو۔ ہاتھ میں جو کوڑے نما چھڑی رہتی تھی اور جس کو ہاتھ میں لیے ہوئے ایک خاص انداز سے جھومتے ہوئے چلا کرتے وہ اگرچہ "ضرب سلطانی" کہلاتی مگر اس سے پیٹنے کا کام کبھی نہیں لیا گیا۔ بجز ایک دفعہ کے سلطان خانے میں ایک نہر نما تالاب تھا۔ جس کا ایک سرا زنانے حصہ میں تھا اور دوسرے سرے پر ایک سڑک تھی جو عوام الناس کا رہ گزر تھی۔ زنانے رخ پر تالاب کے کنارے بعض ذلیل اور ادنیٰ خدمتیں بجا لانے والی متاعیان کھڑی ہو جاتیں اور دور سے ہر گزرنے والے کو ہاتھوں سے چوچنچ بنا کے دکھایا کرتیں۔ ایک دن بادشاہ کی اس پر نظر پڑ گئی۔ جھومتے ہوئے جا پہنچے اور ضرب السلطانی سے مارتے مارتے اس کی کھال گرا دی۔

بادشاہ کو خطاب دینے کا ایسا اچھا ادبی سلیقہ تھا جو کسی اور فرماں روا میں بہت کم دیکھا گیا ہے۔ جتنے خطاب دیئے ہیں نہایت خوبصورت دلکش اور پسندیدہ ہیں۔ صدہا مردوں' ہزارہا عورتوں' سیکڑوں درختوں' بے شمار جانوروں' بہت سے مکانوں باغوں' خاصے کی چیزوں کو اتنے خطاب دے ڈالے جن کی تعداد دس بارہ ہزار سے کم نہ ہوگی اور حافظہ اس بلا کا تھا کہ جس شخص یا جس چیز کو خطاب دیا پھر

جب کبھی سامنے آئی یا اس کا ذکر آیا تو اسی خطاب سے یاد کیا۔ یہ بہت مشہور بات ہے اور اس پر تمام لوگ حیران تھے۔

عمارت اور باغوں کا بڑا شوق تھا اور ان کی تعمیر و ترتیب میں ایسی ایسی جدت طرازیاں کرتے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہو جاتی۔ نازک مزاجی اس درجہ تھی کہ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ عمارت اہتمام سے بنوائی۔ تیاری کے بعد کچھ یا بدنما نظر آئی اسی وقت کھڑے کھڑے مالیوں کو بلوا کر اپنے سامنے کھدوا ڈالی اور پھر بنوائی۔ چمنوں کی ترتیب اور روشوں کے قایم کرنے میں ایسی مناسب شکلیں اور ترتیبیں قائم کرتے کہ سالانہ میلے کے موقع پر بڑے بڑے انگریز انجنیئر آکر متحیر ہوتے اور پوچھتے کہ یہ ڈیزائن کس کا ہے اور جب بتایا جاتا کہ خود بادشاہ نے اپنی طبیعت سے بنوایا ہے تو حیران رہ جاتے اور کہتے "معلوم ہوتا ہے وہ ڈرائنگ اور ڈیزائن بنانے کے بہترین استاد ہیں"۔

ان ایجادوں کے لیے بادشاہ نے ایک عجیب طریقہ اختیار کیا تھا کسی اچھے لفظ یا مجوزہ خطاب کو اپنے ہاتھ سے کاغذ پر لکھ کر روشنائی خشک ہونے سے پیشتر بیچ سے موڑ کے خوب دباتے بعد ازاں کھولتے تو ایک خاص شکل بن جاتی جس میں ہر ایک خط یا زاویئے کا جواب موجود ہوتا۔ اسی کو سامنے رکھ کے اس کے مطابق عمارت یا باغ بنواتے اور بالکل نئی چیز ہوتی۔

ایک کوٹھی شہنشاہ منزل بنوائی جس کی دیواروں کے اوپر کے سرے تاج کے پتوں کی طرح آگے کو جھکے ہوئے تھے۔ اس نے ایک خاص صورت پیدا کر دی تھی اسی کے آگے سانپوں کے لیے کوٹھی کے طول کے برابر ایک دو ڈیڑھ قدم گہرا حوض کھدوایا اس کے چاروں طرف کی دیواریں خوب گھٹوا کے اور چکنی کرا کے اوپر کے سرے آگے کو کالنس کی طرح جھکوا دیئے۔ پھر اس کے اندر ہر طرف سے دو دو گز کا فاصلہ چھوڑ کر ایک مصنوعی پہاڑ بنوایا۔ جس کے اندر سنکڑوں مٹی کی نالیاں رکھیں جو نیچے سے اوپر تک ہر طرف دوڑتی اور چکر کھاتی ہوئی باہر نکلتی تھیں۔ ایک طرف ایک خطہ کاٹ کر آبشار جاری کیا تھا کہ نل کھولتے ہی پانی کی چادر گرنے لگتی۔ نیچے

پہاڑ کے دامن میں چاروں طرف ایک پتلی سی نہری بنائی گئی جس میں صاف پانی بھرا رہتا تھا۔ تیاری کے بعد اس میں ہزاروں دھامنیں چھوڑ دیں۔ یہ بڑے بڑے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گز کے سانپ ایک بل سے دوسرے بل میں جاتے۔ اندر جاتے اور باہر نکلتے رہتے ان کی غذا کے لیے ہزاروں مینڈک پکڑ پکڑ کر روز چھڑوا دیئے جاتے۔ مینڈک اس نہری میں بھاگتے اور سانپ دوڑ کر ان کا شکار کرتے اور بڑا تماشا نظر آتا۔ اس کے مہتمم اور مارپروروں کے داروغہ مرزائی نام ایک شخص تھے۔ جن کو سانپوں کے پکڑنے اور رکھنے کی بہترین اور خاص قابلیت تھی۔ ان کے پاس تابنے اور مٹی کے ظروف میں بہت سے کالے اور رنگ رنگ کے چھوٹے اور زہریلے سانپ بھی رہا کرتے جن کا راتب مقرر تھا۔ اور جس قسم کے سانپ چاہتے تھے منگوا کر دیکھ لیتے۔

لکھنؤ میں بادشاہ کی عمارتیں تو کھد گئیں صرف قیصر باغ اور اس کی بارہ دری موجود ہے۔ جو عمارت بڑے بڑے جلسوں اور کانفرنسوں کے لیے دنیا بھر کی عمارتوں سے زیادہ کارآمد ہے۔ اس لیے کہ ایسی عمارت کہیں نہیں مل سکتی، جس میں بارہ دری کے ہال میں اجلاس ہوں۔ اردگرد کی عالی شان عمارت میں ڈیلیگیٹ اور مہمان ٹھہرائے جائیں جس میں کئی ہزار آدمی نہایت آرام سے ٹھہر سکتے ہیں۔

کلکتہ میں انھوں نے بیسیوں کوٹھیاں بنوا ڈالیں۔ سلطان خانہ، مرصع منزل اور اسد منزل تو برٹش گورنمنٹ سے ملی تھیں۔ ان کے علاوہ بیسوں کوٹھیاں انھوں نے بنوائیں یا خرید لیں جن کا سلسلہ میلوں تک چلا گیا تھا۔ ان میں سے چند کوٹھیوں کے نام جو مجھے یاد ہیں ان کو پیش کرتا ہوں۔ نور منزل، پری منزل، شاہ منزل، تہنیت منزل شہنشاہ منزل، عدالت منزل، قصر البیضا، گوشۂ سلطانی، (یہ ایک کوشک نما بنگلہ تھا) آسمانی، بادامی، تفریح بخش، مد سلطانی، سد سلطانی۔ شاہی عمارتوں کے درمیان ایک بہت بڑی کوٹھی خالی پڑی تھی جو کسی اور شخص کی ملکیت تھی۔ اس کا کمپاؤنڈ بھی آگے پیچھے بہت بڑا تھا، بادشاہ نے اس کو بھی خرید کر خوب آراستہ کیا اور اس کے گرد کے میدان کو جنت ارضی بنا دیا۔

ان کوٹھیوں کی آراستگی اور سجاوٹ دیکھنے کے قابل تھی۔ ان کے گرد پر فضا باغوں کا جو سلسلہ کوسوں تک چلا گیا تھا ایسی نزہت و شادابی کا سماں دکھاتا جو بہت کم دیکھا گیا ہے۔ تمام کوٹھیوں کے گرد باغ اور باغوں کے اندر جا بجا محلات عالیات کی محل سرائیں اور پھر انہیں باغوں میں اکثر جگہ ایسے خاموش نزہت بخش اور پر فضا کنج کہ معلوم ہوتا کوسوں آبادی کا پتہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میل جول اور انسانی تمدن کے شائقین اور شعرا یا فلسفیانہ دماغ والے خلوت پسندوں کے لیے اس پر فضا قطعے میں اپنی دلچسپی کے مطابق جیسی نزہت گاہیں مل جاتی ہیں کہیں نصیب نہیں ہو سکیں۔

بادشاہ کی نازک دماغی اور نفاست پسندی کی یہ حالت تھی کہ کلکتہ میں گیس کی روشنی کو دور سے دیکھ کر پسند کیا تھا حکم ہوا ساری کوٹھیوں میں گیس کی روشنی کی جائے۔ گیس کا سلسلہ مٹیا برج تک تھا۔ لہٰذا تقریباً تین لاکھ کے صرف سے مرصع منزل کے پھاٹک کے باہر ایک فرلانگ سے کم مسافت پر گیس کا کارخانہ بڑے اہتمام سے قائم کیا گیا اور جلد تیار ہو گیا۔ باغات شاہی میں چاروں طرف گیس کی لالٹینیں قائم ہو گئیں۔ پہلے ہی دن روشنی ہوئی۔ اور بادشاہ حسب معمول گاڑی پر سوار ہو کر گشت کو نکلے تو فرمایا بھئی "روشنی تو آنکھوں میں گھسی جاتی ہے" اور گشت کو ملتوی کر دیا۔ دوسرے دن لالٹینوں پر سبز شیشے چڑھا دیئے گئے۔ دوسری رات کو بادشاہ گشت کو نکلے تو سبز شیشوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مگر دو ہی چکر لگائے ہوں گے کہ یکایک ناک سکوڑنا شروع کی اور فرمایا "اس میں بڑی بو آتی ہے۔ میں ایسی روشنی کو برداشت نہیں کر سکتا"۔ غرض دو تین لاکھ کا کارخانہ بالکل بیکار ڈال دیا گیا اور جب سے میں مٹیا برج سے آیا ہوں پڑا پڑا خراب ہو رہا تھا۔ اور پرزوں میں زنگ لگ رہا تھا۔

میرا آنکھ کا معائنہ ہے کہ اسد منزل میں بادشاہ نے ایک جشن کیا تھا ایک روز اس کے ایک بڑے ہال کے درمیان چاندی کے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ گرد بیسیوں متاعوں کا جھرمٹ تھا اور سامنے مجرئی ہو رہا تھا کہ یکایک بیٹھے بیٹھے بادشاہ نے ناک سکوڑی داروغہ اشفاق السلطان (جو محل خانہ کی ایک معزز اور زبان آور متعہ تھیں) اٹھ کے پوچھنے

لگیں " اے جہاں پناہ کیا ہوا؟ " فرمایا " چمپے کے پھول کی بو آتی ہے، جو مجھے ناگوار ہے " کہا گیا " چمپا یہاں کہاں؟ " پھر متاعیوں کی تلاشی لی گئی تو ایک متاعی کے پاس جو پندرہ بیس گز کے فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی اس کے کان میں چمپے کا پھول نکلا۔ تمام دیکھنے والوں کو حیرت ہوگئی اور اس متاعی سے وہ پھول چھین کر باہر دور پھنکوا دیا گیا۔

ایک معمول یہ تھا کہ معززین دربار میں سے جس کسی کا جی چاہتا تھا سال میں ایک دن جہاں پناہ کی دعوت کرتا۔ اس دعوت کی شان یہ تھی کہ کھانا تکلف سے پکوا کر اور خوانوں میں لگا کے امکانی اہتمام کے ساتھ ملا خطے میں بھیج دیا جاتا۔ اور بادشاہ اسے تناول فرماتے۔ لیکن شاہی باورچی خانے میں اس روز جو کچھ پکتا وہ دعوت کرنے والے کے ہاں بھیج دیا جاتا۔ معمولاً دعوت کا کھانا ہزار زیادہ ہو۔ مگر محدود ہوتا اور اس کے معاوضے میں شاہی باورچی خانے کا جو کھانا ان کو ملتا اقسام اطعمہ اور الوان نعمت کے اعتبار سے اتنا خوش ذائقہ ہوتا کہ ویسا کھانا یوں ان کو کبھی نصیب نہ ہوتا اور اتنا زیادہ ہوتا کہ محلہ بھر کھاتا

شاہی جانور خانہ اتنا عجیب تھا کہ ویسا شاید اب ہمیں کہیں نظر نہ آئے گا۔ نور منزل ایک کوٹھی بادشاہ نے دریائے بھاگرتی سے سو دو سو گز کے فاصلے پر خاص اپنے اہتمام سے بنوائی تھی۔ اس سے ملا ہوا ایک تالاب تھا جس کے چاروں طرف پختہ زینے بنوا دیئے گئے تھے۔ تالاب کے اس پار نور منزل کے مقابل ایک بڑا کٹہرا تھا۔ جس میں شیر رہتا اور جب وہ گرجتا تو سارے مٹیا برج میں اس کی آواز گونج جاتی اور کوٹھی اور تالاب کے گرد ایک بڑا کمپونڈ چھوڑ کے آہنی کٹہرا نصب کر دیا گیا تھا اور ایک طرف اس کمپونڈ میں ایک نہایت نازک اور خوب صورت آہنی بنگلہ تھا۔ اس کمپونڈ میں دنیا بھر کے چرند پرند لا کے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ ہرن اور چکارے چوکڑیاں بھرتے پھرتے۔ بارہ سنگے متانت سے ٹہلتے پھرتے۔ سارس، قازیں، بگلے، ہنس اور مور وغیرہ ادھر ادھر پھرتے یا تالاب کے کنارے ایک ٹانگ اٹھائے گھنٹوں کھڑے رہتے۔ کٹہروں میں وحشی جانور اور درندے رکھے گئے تھے۔ جن میں سیار، بھیڑیے، کینگرو وغیرہ بند تھے۔ کینگرو کا بچہ

ماں کے پیٹ سے نکل کر ٹہلتا، اور جہاں کسی نے دھمکایا دوڑ کے پھر ماں کے پیٹ میں گھس جاتا۔ چھوٹے چھوٹے پرندوں میں بیسیوں شتر مرغ اور کشوری تھے جو پتھر کے بڑے بڑے روڑے اور لوہے کے ہتھوڑے تک بلا تامل نگل جاتے۔ کئی ایک بڑے بڑے کچھوے چھوٹے پھرتے تھے جو زیادہ تر خشکی میں رہتے اور جب جی چاہتا پانی میں جاتے۔ یہ کچھوے بھاری سے بھاری بوجھ کو اٹھائے جاتے۔

وہاں تمام لوگوں میں سب سے موٹے منشی اللطان تھے جن کا بوجھ پانچ چھ من سے کم نہ ہوگا۔ بادشاہ نے ایک دن ان کو کچھوے کی پیٹھ پر بٹھا دیا اور وہ بے تکلف اپنی معمولی چال سے تالاب کے کنارے تک اٹھائے گیا۔

ایک کٹہرے میں بن مانس تھا۔ اور یہ کمپونڈ جو رمنہ کہلاتا تھا اس کے باہر راستے کے ایک جانب بہت سے بنگلے نما کٹہروں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ جن میں ملک ملک کے اور دور دور کے بندر لا کر جمع کیے گئے۔ ان میں لنگور اور ڈھکو بھی تھے۔

ایک نہایت ہی خوب صورت چھوٹی سی بندریا تھی جو پیاری معلوم ہوتی۔ اس کو ریشمی خوب صورت گھنگریا اور شلوکہ پہنا دیا گیا تھا اور ایک آدمی اس پر مقرر تھا جو اسے گود میں لیے پھرتا اور جو شخص دیکھتا قریب جا کر اسے سہلاتا اور وہ پیاری حرکتیں کرتی اتفاق سے ایک سال میلے کے موقع پر جب کہ کلکتہ کے بڑے بڑے حکام انگریز اور انگریزنیں، ہندوستانی معززین رمنے کی سیر کو آئے تھے۔ بہت سی میموں نے اسے گھیر لیا اور گود میں لے لے کر پیار کرتے لگیں۔ خدا جانے اسے ان کی کون سی بات بری معلوم ہوئی کہ ایک انگریزن کا منہ نوچ لیا اور اس کا گال زخمی کر دیا۔

ایک چھوٹے کٹہرے میں شرمائی بلی تھی۔ جس کا نام ہمیشہ سنا تھا مگر صورت وہیں دیکھی، وہ نہایت ہی شرمیلی آنکھیں آہستہ آہستہ ہاتھوں میں سے سر نکال کے کھولتی اور جہاں کوئی پاس آیا یا کسی نے کچھ کہا یا کھنکارا جلدی سے منہ چھپا لیتی۔ اس کی یہ ادا دیکھنے کے لیے لوگ گھنٹوں اس کے پاس کھڑے رہتے اور بڑا لطف آتا۔

سفید مور کا جوڑا جس کے پر دھوئے ہوئے کپڑے یا سفید کبوتروں کے ایسے

تھے، سنتے ہیں کہ بادشاہ نے گیارہ ہزار روپے کو لیا تھا اور پھر اس کی نسل بڑھی تو بہت سے ہو گئے۔

کلکتہ میں کسی نے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ بادشاہ نے اس زندہ عجائب خانے میں ایک ہاتھی کا بچہ بھی خرید کے رکھ لیا تھا۔ جو کھیلتا اور بڑی دل لگیاں کرتا۔ خصوصاً بچوں کے ساتھ کھیلنے میں اسے بڑا مزا آتا۔

زرافہ افریقہ کے صحراؤں کا ایک عجیب جانور ہے۔ سر گھوڑے کا ایسا جس پر دونوں کانوں کے درمیان ایک کلغی سی ہوتی ہے۔ گردن اونٹ سے زیادہ لمبی مگر گھوڑے کی طرح گاؤ دم۔ پاؤں اونٹ سے زیادہ لمبے اور بلند۔ پیٹھ گھوڑے کے مانند سڈول اور گول مگر چھوٹی اور تنگ ہوتی ہے۔ اس جانور کو ہندوستان بھر میں شاید کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ مگر بادشاہ نے اس کا ایک جوڑا ہزاروں روپیہ قیمت میں خرچ کر کے منگوایا اور رمنے کے اندر ایک بلند درخت میں بندھوا دیا تھا۔ سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ زرافہ کا سر زمین تک نہیں آسکتا اور نہ زمین پر سے وہ گھاس چر سکتا ہے۔ چنانچہ درخت کی بلندی پر لکڑی کے بڑے بڑے کونڈے بندھوائے گئے تھے جن میں سیڑھی پر چڑھ کے ان کے لیے دانا اور پانی ڈال دیا جاتا۔

درندوں میں سے مذکورہ شیر ببر کے علاوہ اور بہت سے شیر اور تیندوے مختلف کوٹھیوں میں بند تھے۔ کئی سیاہ شیر تھے جو بالکل کالے کتے کے مثل تھے اور لوگ انھیں دیکھ کر تعجب کرتے۔ شہنشاہ منزل میں سانپوں کے پہاڑ میں بھی دو کٹہرے بنوا دیئے گئے تھے جن میں بڑی بڑی چیتیں یعنی اژدھے بند تھے۔ وہ اکثر پڑے رہتے اور رینگتے بھی تو بہت آہستہ آہستہ مگر جب راتب کے طور پر مرغ اندر ڈالا جاتا تو اس کو بڑی پھرتی سے پکڑ کے نگل جاتے۔

چیتے اور سیاہ گوش تھے۔ مگر وہ بجائے کٹہرے میں بند کرنے کے زنجیروں میں بندھے پلنگوں پر لیٹے رہتے۔ ان پر تعلیم دینے اور رکھنے والے مقرر تھے جو انھیں شکار کی تعلیم دیتے۔ چیتے آنکھیں کھول کے بھیڑ یا بکری پر چھوڑے جاتے تو اس

طرح زمین سے ملے ہوئے جھپٹتے کہ معلوم ہوتا کہ ہوا کا بگولا خاک اڑاتا چلا جاتا ہے چیتے پالنے والے ان کی خوشامدیں کرتے اور چیتے کو یار بنا کر ان کا غصہ فرو کرتے۔ سیاہ گوش میں بلا کی پھرتی تھی اس کے سامنے کبوتر چھوڑا جاتا تو دس پندرہ گز تڑپ کے پکڑ لیتا۔

کلکتہ میں اونٹ بھی کم دیکھے گئے ہیں اور ہندوستان میں جو اونٹ ہوتے ہیں وہ بالکل معمولی قسم کے ہیں۔ بغدادی اونٹ جن کے آگے پیچھے دو کوہان ہوتے ہیں اور پیٹھ کے اوپر قدرتی طور پر بیٹھنے کی بہت اچھی جگہ بنی ہوتی ہے شاید کسی نے نہ دیکھے ہوں گے۔ ایک ترکستانی تاجر اس قسم کے چھ سات اونٹ لایا اور بادشاہ نے منہ مانگے دام دے کر سب خرید لیے۔

سلطان خانے میں بہت سے بڑے مکان بنائے گئے تھے جن کے چاروں طرف آہنی جال تھا اور کنج کہلاتے۔ ان میں صدہا قسم کے طیور لا کے چھوڑ دیئے گئے تھے جو ان میں آزادی سے چاروں طرف اڑتے اور خوش رہتے۔ اکثر انڈے دیتے اور بچے نکالتے کیوں کہ ان کے لیے جھونجھ لگانے کی جگہیں بنا دی گئی تھیں۔ انھیں کنجوں میں سے ایک میں طوطے کے ایسے سبز رنگ کبوتر جن کے گلوں میں نیلگونی تھی۔ بہ کثرت چھوٹے تھے۔ اس کے رنگ کے کبوتر اور کبوتروں کی طرح چھوٹے نہ رہ سکتے تھے۔ اور سنتا ہوں کہ بادشاہ نے کبوتر بڑے اہتمام اور صرف سے منگوائے تھے۔

توے اور کاکاتوے جتنے رنگوں اور خوب صورت بادشاہ کے یہاں جمع تھے اور برنجی اڈوں پر بیٹھے رہتے تھے شاید کہیں کم نظر آئیں گے۔

لنمہ سنج اور بجروں میں رہنے والے طیور کی اس قدر کثرت تھی کہ صبح کو ان کے پنجرے صاف کرنے اور دانا کرم اور گوندا دینے کے لیے سلطان خانے کے پشتے پر دو تین سو جانور بازوں کا ہجوم ہوتا تو معلوم ہوتا کہ ایک میلہ لگا ہوا ہے پنجرے ایسے خوبصورت صاف باآب اور چمک دار تھے کہ تیلیاں کھول کر ہوا میں رکھے جاتے

اور ان پر شعاعِ آفتاب پڑتی تو معلوم ہوتا کہ ساری زمین سونے کی ہو گئی ہے۔

ان طیور کی کثرت اور ان کی خریداری کا سلسلہ جاری رہنے کا سب سے زیادہ ثبوت یہ ہے کہ متعدد ٹھیکہ دار ہفتہ وار لکھنؤ کے نخاس سے ہزارہا جانور اور کبوتر خرید کے بھیجا کرتے اور سب خرید لیے جاتے۔ ایک کابلی معزز پٹھان غلام محی الدین خان بلبل باز مع اپنے دو بھائیوں اور کابلی و بدخشانی ملازموں کے ہمیشہ منشی السلطان کے گھر مہمان رہتے اس لیے کہ جانور خانہ منشی السلطان ہی کے سپرد تھا اور چوں کہ میں بھی وہیں رہتا تھا لہٰذا چھ سات سال تک برابر اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا انھیں کے ساتھ تھا اور ہر وقت ان لوگوں سے فارسی میں باتیں کرتے گزرتی۔ وہ بدخشاں سے بلبل ہزار داستان ہزاروں کی تعداد میں منگواتے۔ جن میں سے چھنٹے ہوئے بادشاہ کے یہاں خرید لیے جاتے اور جو بچتے کلکتہ کے امرا میں فروخت ہو جاتے۔ یہ جانور کیا ہے ایک ارگن باجا ہے کہ ہر وقت بجتا رہتا ہے اور اس سے سر نکلتے ہیں اور ایسی لے میں مرتب ہوتے کہ کسی مصنوعی باجے سے ممکن نہیں۔ مگر نہایت نازک مزاج جانور ہے۔ نہ ہندوستان کے موسم کو برداشت کر سکتا ہے اور نہ ذرا سی بے پروائی اور بے اعتدالی کی تاب لا سکتا ہے۔ اس کی داشت بھی بدخشانی لوگ ہی جانتے ہیں جو یہاں کے جانور بازوں کو ان کے رکھنے کا طریقہ بتاتے۔ روز تڑکے صبحِ صادق کے وقت ان کی بتنی میں بند پنجروں کو جانور باز پہلے کسی پنہاری کے مکان کے پاس کھڑے ہو کر چکی چلنے کی آواز تقریباً آدھ گھنٹے تک سناتے پھر کسی باغ میں لے جا کے جہاں نسیمِ سحر چل رہی ہو، پھول کھلے ہوں اور ان کی خوشبو مہک رہی ہو کسی بلند چبوترے پر بتنی کھول کے رکھ دیتے۔ بابا خاں نام ایک بدخشانی دوست کے ساتھ جو اسی خدمت پر مامور تھا اور میرے ساتھ رہتا میں اکثر اس سیر میں گیا ہوں اور جیسے ہی بلبل کا پنجرا کھول کے چمن کے درمیان میں رکھا جاتا اس وقت اس کا خوش ہو ہو کے چہچہانا اور مست ہو ہو کے نغمہ سنجی کرنا دیکھنے اور سننے کے قابل ہوتا تھا آہ وہ پھر کبھی نہ نظر آئے گا۔ یہ بہار واجد علی شاہ کے ساتھ قبر میں دفن ہو گئی۔

عام جانوروں کی تقریباً پانچ سو تعداد اور پچیس تیس مار پروروں (سانپ پالنے والوں)

کے علاوہ ستر اسی ماہی پرور تھے جن کے ذمے یہ خدمت تھی کہ مچھلیوں کی حفاظت اور داشت کریں اور انہیں مقررہ اوقات میں غذا اور چارہ دیا کریں۔ نور منزل کے سامنے والے تالاب میں کوٹھی کی سیڑھیوں سے دس بارہ گز ہٹ کے پانی کے اندر دیوار کا ایک پردہ قائم کر دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے تالاب کا جو حصہ کوٹھی سے ملا تھا اس کی شان ایک حوض کی سی ہو گئی تھی۔ اس میں نہایت عمدہ بڑی اور چھوٹی مچھلیاں کثرت سے تھیں اور بڑے تالاب میں بڑی بڑی مچھلیاں۔ جب آٹے کی گولیاں ڈالی جاتیں تو دم بھر میں ہزاروں جمع ہو جاتیں اور خوب خوب خوش فعلیاں کرتیں۔ کبھی کبھی بادشاہ خود آ کے بیٹھ جاتے۔ اپنے ہاتھ سے چارہ ڈالتے اور دیر تک مچھلیوں کی بہار دیکھا کرتے۔

اسی طرح مختلف کوٹھیوں میں متعدد تالاب تھے اور بہت سے سنگ مرمر کے یا پختہ حوض تھے ان سب میں قسم قسم کی مچھلیاں رکھی گئی تھیں اور سب پر ماہی پرور مقرر تھے اور ان کی غذا کے لیے بادشاہ کی تنخواہ سے ماہانہ قسط داروغہ ماہی پروروں کو ملا کرتی۔

ایک بڑا عملہ کبوتر بازوں کا تھا جن کی تعداد دو سو کے قریب ہو گی۔ داروغہ کبوتر خانہ داروغہ عباس علی خاں نامی ایک عجیب بزرگ تھے ان کا مکان عمارت شاہی کے حدود سے باہر ایک تالاب کے کنارے واقع تھا اس پر پچیس تیس گز کے فاصلے تک مچان باندھ کے ایک چوبی بنگلہ بنا دیا گیا تھا۔ جس میں ان کی نشست رہتی۔

عباس علی خاں ایک پکّے افیونی تھے اور افیونیوں کے عام مشاغل اور ان کے کیرکٹر کا مکمل ترین نمونہ تھے۔ ان کے اس بالائے آب بنگلے میں ہر وقت بہت سے افیونیوں کا مجمع رہتا۔ لونڈے چھلنے اور افیون کے پیالوں کے ساتھ ساتھ چائے کے پیالوں کی کثرت ہوتی اور اکثر چانڈو کے چھینٹے بھی اڑاتے جس کے داروغہ صاحب بڑے رسیا تھے۔

ہر جمعہ کو بٹیروں کی پالیاں ہوتیں اور بڑے بڑے دعوے کے بٹیر باز اپنے کریز

لا کے لڑاتے۔ سو سو دو دو سو بلکہ بعض اوقات پان پان سو کی بازی کے بٹیر لڑائے جاتے گرد شوقین بدنے والوں کا مجمع ہوتا اور دونوں طرف کے لوگ چلا چلا کے اور شور مچا مچا سوائے ڈیوڑھی اور دونی کے نعرے بار بار لگاتے اور جب تک بٹیر لڑتے ایک ایسا شور محشر برپا رہتا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی۔ منشی السلطان بہادر کے بیٹے سردار مرزا صاحب کو بھی بٹیروں کا بڑا شوق تھا چنانچہ مرزا ولی عہد بہادر اول کے انتقال کے وقت ان کا سارا بٹیر خانہ انھوں نے خرید لیا۔ میں ان کو بھائی صاحب کہا کرتا اور میرے حال پر بڑی شفقت فرماتے۔ اکثر ان کی صحبت میں ان کے ملازم بٹیر بازوں کا تماشا دیکھا کرتا اور ان کی لن ترانیاں سنتا۔ میں خود بھی اکثر بٹیر پالتا۔ سردار مرزا صاحب اپنے پچاس ساٹھ استاد بٹیر بازوں اور طرفداروں کو لے کر ہر جمعہ کو داروغہ عباس علی خاں کے یہاں پالی میں جاتے اور بارہا میں بھی ساتھ گیا۔ اس لیے کہ ایک پرانے افیونی محمد خاں سے جو سردار مرزا صاحب کے بٹیر خانے کے مہتمم تھے، مجھ سے گہری دوستی ہو گئی تھی۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک معرکہ آرا پالی میں سردار مرزا صاحب کا کرنیز "شہرہ آفاق" میدان میں اترا اس کے مقابل داروغہ عباس علی خاں کا نامی بٹیر "کیفنچو" آیا اور آدھ گھنٹے تک قیامت خیز لڑائی ہوتی رہی۔ مگر میں بٹیروں کے عوض آخر تک تھے۔ داروغہ عباس علی کی حالت وصورت دیکھتا رہا۔ وہ اکڑوں بیٹھے ہمہ تن بٹیروں میں محو تھے۔ دونوں ہاتھوں میں بلا کا تشنج تھا۔ سارے جسم سے اینٹھے اور بسرے جاتے تھے۔ ان کا بٹیر جو چونچ مار کے کھینچتا تو وہ اس طرح منہ چھپاتے کہ معلوم ہوتا کہ انہیں نے چونچ ماری ہے اور جب حریف کا بٹیر ان کے بٹیر کو لات مارتا تو معلوم ہوتا کہ انہیں کسی نے کس کے لات رسید کر دی۔ الٹے پیچھے گرتے اور چوٹ کھانا ان کی صورت سے محسوس ہوتا۔

ان کے یہاں اکثر جمعہ کو داستان ہوتی۔ خود داستان گو اور سامعین بجز میرے سب افیونی ہوتے مگر میں نے ایسا فصیح و دلکش داستان گو آج تک نہیں

داستان کے چار فن ہیں۔ رزم بزم، حسن وعشق اور عیاری۔ دونوں کے وہ بادشاہ تھے۔ خصوصاً حسن وعیاری کو ایسا بیان کرتے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ وہ خوش رو اور چالیس پینتالیس کی عمر کے آدمی تھے۔ مگر اکڑ کے اور سینہ تان کے بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ ایک خوش رو نوعمر پہلوان ورزش کر کے بیٹھا ہے۔ حسن کا نقشہ کھینچتے تو معلوم ہوتا کہ انھیں کا چہرہ اس حسن کی تصویر ہے اور بہت ہی خوب صورت نظر آنے لگتے۔ میں نے مہینوں ان کی داستان سنی ہے۔ افسوس کہ ان کا نام یاد نہیں رہا مگر ان کی فصیح البیانی اور فصاحت وخوبی کلام کا پہلا نقش تھا جو میرے دل پر پڑا۔

غرض داروغہ عباس علی خاں کا مکان مٹیا برج میں لکھنؤ کی اس وقت کی ایک خاص سوسائٹی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔ لکھنؤ کے نامی گرامی ہزل گو شاعر میاں مشیر ایک مدت کی غیبت کے بعد جب مٹیا برج میں نمایاں ہوئے ہیں تو اسی مکان میں آکے فروکش ہوئے تھے۔ میں نے اکثر انھیں دیکھا اور آخر وہیں انھوں نے انتقال کیا۔

داروغہ عباس علی خاں کے زیر افسری تقریباً دو سو کبوتر باز تھے۔ کبوتر کسی ایک جگہ نہ تھے۔ بہت سی کوٹھیوں میں ان کی کابکیں تھیں۔ اسد منزل میں ان کے جال دار کنجوں کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا تھا اور سب جگہ حسب ضرورت باز مقرر تھے۔ ریشم پرے کبوتروں کا جوڑا کہتے ہیں کہ بادشاہ نے چوبیس ہزار روپے کو لیا تھا۔ وہیں ان کی نسل بڑھی اور لکھنؤ تک پھیل گئی۔ بادشاہ کے انتقال کے وقت ان کبوتر خانوں میں کہتے ہیں پچیس ہزار کبوتر موجود تھے۔ جن میں اڑنے والے گولے، لمبی اڑان کے گرہ باز اور صرف پالنے کے شیرازی اور انواع واقسام کے کبوتر تھے۔

منشی السلطان کے زیر اہتمام بہت مینڈھے بھی پلے ہوتے تھے۔ جو وقتاً فوقتاً لڑائے جاتے اور معلوم ہوتا کہ پہاڑ پہاڑ سے ٹکرا گیا۔ میں بیان کر چکا ہوں کہ بادشاہ کو انگریزوں کی ملاقات سے قطعاً انکار تھا۔ وزیر السلطان امیر علی خاں بہادر تمام اعلیٰ درجہ کے انگریزوں اور وائسرائے بہادر تک سے ملتے اور بہت چاہتے کہ بادشاہ بھی ان لوگوں سے ملا کریں۔ مگر جہاں پناہ نے کسی طرح منظور نہ کیا۔ امیر علی خاں یہ

حسرت لیئے ہوئے مرگئے۔ اس بارے میں بادشاہ کی قیداور احتیاط اس درجہ تک بڑھی ہوئی تھی کہ شاہی کوٹھیوں کے باغوں میں سواری نکلتی تو بیرونی پھاٹک بند کروادیئے جاتے اس لیئے کہ ایک مرتبہ کوئی انگریز ایک پھاٹک کے باہر سے بادشاہ کی سواری دیکھ رہا تھا بادشاہ کی اس پر نظر پڑ گئی ۔

سالانہ میلوں کے موقع پر بادشاہ کا معمول تھا کہ سلطان خانہ کے اندر سب سے الگ بیٹھے رہتے اور پاس والے طیور کے پنجروں کو باہر بھجوا دیتے جو ٹبتنیاں کھول کے رکھ دیئے جاتے۔ امیر علی خاں کے انتقال کے بعد ایک میلے کے موقع پر جب کہ صدہا انگریز اور کلکتہ کے معززین جمع تھے۔ خدا جانے دل میں کیا آئی کہ خلاف عادت بوچے پر سوار برآمد ہو گئے۔ انگریزوں نے دیکھتے ہی ٹوپیاں اچھال اچھال کے خوشی کے نعرے بلند کیے اور ہر طرف "ہرّے" کا شور مچ گیا۔ بادشاہ یہ دیکھ کر خوش ہو گئے انگریزوں کے غول میں آگئے اور انھوں نے اپنے حلقہ میں لے لیا اور زیادہ نعرہ ہائے مسرت بلند کرنے لگے ۔ ان کے خوش کرنے کے لیے بادشاہ نے مینڈھے منگوا کر لڑانا شروع کیے۔ تمام اہل دربار کہہ رہے تھے کہ " امیر علی خاں " کہتے کہتے مر گئے اور شنوائی نہ ہوئی اور آج شاہی بوچہ انھیں لوگوں کے حلقے میں ہے امیر علی خاں زندہ رہتے تو انھیں اس وقت کیسی خوشی ہوتی ۔

دوسرا بڑا عملہ مکان داروں کا تھا ۔ ان لوگوں کے ذمّے یہ خدمت تھی کہ کوٹھیوں اور مکانوں کو خوب صاف ستھرا اور آراستہ و پیراستہ رکھتے ۔ یہ لوگ بھی چار پانچ سو کی تعداد میں تھے ۔ اور چونکہ کوٹھیاں دور دور اور باغوں کے جدا جدا حلقوں میں پھیلی ہوئی تھیں اس لیے یہ لوگ بھی تمام کوٹھیوں بنگلوں اور کمروں میں پھیلے ہوئے تھے ۔ یہ ہر کمرے کے اندر جھاڑو دیتے۔ فرش خوب صفائی سے بچھاتے کہ کہیں شکن نہ رہنے پائے ۔ دیواروں کو جھاڑتے ۔ تصویروں، گلدستوں وغیرہ کو جھاڑ پونچھ کے قرینے سے لگاتے اور مختلف کمروں میں جو خاصے کے نقرئی پلنگ بچھے رہتے ان کے بچھونے خوب صفائی سے کھینچ کے پایوں کے سروں پر ڈوریاں کستے ۔ ادقچہ

یعنی بچھونے کی چاروں طرف کی صاف اور خوشنما چنٹ دار جھالر کو درست کرتے۔ چادریں اور تکیوں کے غلاف بدلتے اور ان کو صاف و براق رکھتے۔ ہر پلنگ پر چار تیلے اور لمبے تکیے سرھانے کے ہوتے اور ان پر ننھے ننھے گل تکیے گالوں کو ٹکانے کے لیے رکھے جاتے اور پٹیوں کی جانب دو نرم گدگدی گول تکنیاں ہوتیں۔ ہر کوٹھی سامان آرائش سے مکمل ہوتی۔ اس کے پلنگ کھنچے کھنچائے ہر وقت تیار رہتے۔ گویا منتظر تھے کہ جہاں پناہ کب تشریف لا کے ان پر جلوہ فرما ہوں گے۔

اکثر کوٹھیوں میں بادشاہ کا کبھی برسوں گزر نہ ہوتا مگر ان کی آبادی مکان داروں مالیو اور کبوتر بازوں اور دیگر ملازمین شاہی سے ہوتی۔ باہر کا غیر پرندہ بھی پر نہ مار سکتا۔

دوسری آبادی ان کوٹھیوں کی محلسراؤں سے رہتی جو اکثر کوٹھیوں میں تعمیر کر دی گئی تھیں اور ان میں جن محلات عالیات کو حکم ہوتا سکونت پذیر ہوتے۔ ان کی ڈیوڑھیوں پر تین تین چار چار سپاہی مقرر تھے اور ان کے علاوہ لواحق بیگمات ان کے علاوہ لواحق بیگمات یعنی محل کے اعزا و اقارب اور ماما ئیں پیش خدمتیں مغلانیاں اور کہاریاں وغیرہ رہتیں۔ جن کی بدولت اچھی خاصی آبادی ہوتی۔ اکثر محلات کے مردانہ کمروں میں ان کے داروغہ رہتے اور سمجھا جاتا کہ ان داروغاؤں کا محل سے ناجائز تعلق ضرور ہے۔

ان کوٹھیوں کے گرونڈ بلند دیواروں اور اکثر جگہ کوٹھریوں کے حلقوں میں محصور تھے۔ جن میں غیر تو غیر پولیس کے سپاہیوں اور عدالت کے چپراسیوں کی بھی مجال نہ تھی کہ اندر قدم رکھیں۔ اس واقعہ نے شاہی کوٹھیوں کو بڑی امن کی جگہ قرار دے دیا تھا۔ گورنمنٹ انگریزی کے احکام کی تعمیل اور فوجداری و دیوانی وارنٹوں سمنوں اور ڈگریوں کے اجرا کے لیے یہ طریقہ رکھا گیا تھا کہ ابتداً نواب وزیر السلطان بہادر کے زیر اقتدار ایک خاص شاہی پولیس گارد رکھا گیا تھا جس کے ملازمین میٹابرج کی اصطلاح میں "بکٹ کے سپاہی کہلاتے"۔ سرکاری پولیس سے جدا قسم کی ان کو وردیاں دی گئی تھیں۔ جب کبھی فوجداری کے مجرم یا گواہ یا مدیون ڈگری کی نسبت عدالتوں میں ظاہر کیا جاتا کہ وہ عمارات شاہی کے اندر فلاں کوٹھی یا فلاں مقام میں مقیم ہے تو وزیر السلطان کے دفتر میں سرکاری حکم آتا اور نشاندہی

کے مطابق بکٹ کے سپاہیوں کے ذریعے سے اس کا اجرا ہوتا. پھر نواب امیر علی خاں کا انتقال ہوا منصرم الدولہ بہادر وزارت کے عہدے پر ممتاز ہوئے اور بکٹ کے سپاہی ان کے ماتحت ہو گئے.

جس کسی کے نام کوئی وارنٹ یا ڈگری ہوتی وہ عمارات شاہی کے اندر جا کے ٹھہرتا اور گرفتاری سے بچ جاتا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار منشی السلطان بہادر کے خلاف دیوانی کا وارنٹ جاری ہوا وہ بادشاہ سے اجازت حاصل کر کے شاہی کوٹھی گوشۂ سلطانی میں چلے گئے۔ ڈگری دار نے عدالت میں نشان دہی کی کہ وہ گوشۂ سلطانی میں ہیں۔ منصرم الدولہ کے نام اس کوٹھی کے اندر تعمیل وارنٹ کا حکم آیا۔ ان کو منصرم الدولہ نے پہلے سے خبر کر دی۔ چنانچہ وہ وہاں سے اٹھ کے کسی اور کوٹھی میں چلے گئے اور وارنٹ گوشۂ سلطانی میں آ کے واپس گیا۔ اس لئے کہ اور کسی کوٹھی میں تعمیل غیر ممکن تھی۔ بہت سے ادنیٰ درجے کے فوجداری مجرم مدت تک ان کوٹھیوں کے عملے کے مکانات میں اپنے عزیز یا دوست کے پاس ٹھہرے رہے۔ نہ کسی کو پتہ لگا اور نہ گرفتار ہوئے۔

یہ امر اکثر انگریز حکام کے خلاف گزرتا تھا۔ چنانچہ کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک چیف جسٹس نے اپنے فیصلے میں لکھ دیا کہ "شاہ اودھ نے اپنی کوٹھیوں کو گورنمنٹ کے خلاف ایک قلعہ بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے نہ سرکاری احکام کی تعمیل ہو سکتی ہے اور نہ انصاف ہو سکتا ہے" مگر گورنمنٹ نے بادشاہ کے جیتے جی ان کے محلات اور مکانات کی آزادی میں کبھی خلل نہ ڈالا۔

بعض بدمعاشوں نے بارہا اس مامن شاہی سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ سلطان خانے سے ملا ہوا بچالی گھاٹ تھا۔ جہاں دریا کنارے پیال کی ایک بہت بڑی منڈی تھی۔ اس سے ذرا آگے بڑھ کے رنڈیوں کا ایک ناپاک محلہ تھا۔ ڈھیمنی پاڑہ جس میں بہت ذلیل قسم کی بازاری قحبائیں رہتیں۔ ان کے شوق میں اکثر قلعے کے سولجر یا جہازی گورے آ جاتے اور ان کا معمول تھا کہ سڑک کے کسی لونڈے کو ساتھ لے لیتے کہ ہمیں وہاں تک پہنچا دو۔ ایسے بعض شہدے لونڈے یہ حرکت کرتے کہ ان

سے روپیہ دو روپے کی رقم اینٹھ لیتے اور بچالی گھاٹ سے گھما کے سلطان خانے کے پھاٹک تک لاتے اور ایک ہی جست میں پھاٹک کے اندر ہو رہتے اور گورے ان کے پکڑنے کے لیے اندر آنا چاہتے تو سپاہی انھیں دھکیل کے باہر کر دیتے۔

میٹیا برج کی شاہی عمارتیں نزہت و شادابی رکھتی تھیں عالیشان کوٹھیوں کے گرد پر فضا باغ، دل کش چمن بندیاں اور ان کے آس پاس محلسرائیں جن میں سے بعض کے پردوں سے سر نکالے ایسی پیاری دلربا صورتیں نظر آجاتیں کہ معلوم ہوتا اس جنت ارضی میں حوریں بھی موجود ہیں۔

اسد منزل میں دو بڑی محل سرائیں تھیں جن میں سے ہر ایک متعدد مکانوں کا مجموعہ تھی۔ ایک رادھا منزل اور دوسری ساردھا منزل۔ ان کے اندر تعلیم پانے والی خوب صورت اور جادو نگاہ گانے والی ممتوعات رہتی تھیں۔ جن کو روز ڈھاڑی گانے ناچنے کی تعلیم دیا کرتے۔ ان محلسراؤں کے پردے کبھی دلربا ماہ وشوں سے خالی نہ رہتے۔

سلطان خانے میں جو جہاں پناہ کا خاص کاشانۂ دولت تھا۔ منتخب اور پری جمال ممتوعات کا مجموعہ تھا۔ کسی کا نام پری جمال بیگم تھا، کسی کا حور تمثال بیگم، کسی کا نام گلرخ بیگم، کسی کا نازک اندام بیگم۔ یہ بھی چونکہ خاص خاص فنون موسیقی میں کامل تھیں لہذا ان کے متعدد گروہ یا طائفے تھے اور ان پری وشوں کے ذاتی دل کش اداؤں کے علاوہ وضع لباس اور کام کی مناسبت سے ہر طائفے کا جداگانہ لقب قرار دیا تھا۔ ایک گروہ جھومر والیوں کا تھا، ایک لنگن والیوں کا ایک تتھ والیوں کا' ایک نقل والیوں کا' ایک کھیمٹے والیوں کا (کھیمٹا بنگالے کا خاص قسم کا ناچ ہے جس میں حسین عورتیں بیسوں انداز سے کمر کو ہلایا اور گھمایا کرتی ہیں۔ کلکتہ میں اس کا بہت رواج ہے) اسی طرح بہت سے گروہ تھے۔ ان میں سے اکثر نازنین زنانی ڈیوڑھیوں سے جھانکتی رہتیں اور بعض ایسی شوخ تھیں کہ راہ گیروں پر کوئی آوازہ کس دیتیں یا کوئی پھبتی کہہ گزرتیں۔ یہ ایک ایسی دل چسپی کا سامان تھا کہ ثقہ سے ثقہ لوگ

بھی کبھی آنکھیں سینکنے کے لیے ادیدا کے انھیں راستوں سے گزرتے اور ہر شخص کے لیے جب اور جس وقت چاہے دل چسپی کا سامان مہیا نظر آتا۔

ہمارے پرانے مہذب لوگ ان باتوں کو بدتہذیبی اور داخل معصیت بتاتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کی صحبت یورپ کے شہروں تھیٹروں میوزک ہالوں اور وہاں کی تفریح گاہوں میں جاؤ تو نظر آجائے گا کہ آج کی مہذب دنیا ان دل چسپیوں کو حیات انسانی کے لیے کس قدر اہم اور ضروری سمجھتی ہے اور واجد علی شاہ مرحوم نے جو کچھ کیا ہمارے ان معلمین اخلاق کے درجے سے بہت ہی کم تھا۔

بادشاہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ناچتے تھے۔ یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ انتزاع سلطنت کے وقت جہاں اکثر شہزادوں اور خاندان شاہی اودھ کے نامور لوگوں کو ان کے خلاف بنایا گیا، ان کی برائیاں طشت از بام کی گئیں وہاں ناچنے کا الزام بھی ان کے سر تھوپا گیا۔ بہت سی قلمی تصویریں ملک میں پھیلا دی گئیں جن میں دکھایا ہے کہ وہ محلات کے غول میں کھڑے ناچتے اور بھاؤ بتا رہے ہیں۔ مگر مجھے خوب تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ سب وضعی اور جعلی ہیں۔ جو کچھ قیصر باغ کے میلوں کے موقع پر مشہور ہے اس کی اصلیت یہ ہے کہ بادشاہ ناچتے نہیں بلکہ کھیلتے تھے اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ کبھی لکھنؤ میں بہ عہد حکومت ناچے اور نہ کبھی میٹابرج میں ناچے۔ یہ اور بات ہے کہ بہ کثرت ناچ دیکھنے اور موسیقی کے استاد ہونے کے باعث فن رقص میں بھی انھیں اتنی بصیرت حاصل ہو گئی تھی کہ جب کوئی ناچنے والی ناچ میں غلطی کر جاتی تو پلنگ پر بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھ اٹھا کے بتا دیتے کہ یوں نہیں۔

گانے میں البتہ کمال حاصل تھا۔ اگرچہ گلا اچھا نہ تھا مگر اصول موسیقی کو ایسا سمجھتے کہ بڑے بڑے گویے ان کے سامنے کان پکڑتے۔ تاریخوں میں ہندوستان میں کئی مسلمان بادشاہ موسیقی کے کامل استاد بتائے گئے ہیں۔ مگر میں نہیں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کسی کو بھی اتنی اعلیٰ معلومات حاصل ہوں جتنی واجد علی شاہ

کو حاصل تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ولی عہدی سے لے کر آخر عمر تک ہمیشہ بڑے بڑے مستند گویوں کا ان کے گرد ہجوم رہا اور ان کی قدر دانی میں بادشاہ سے افسوسناک بے اعتدالی ظاہر ہوئی کہ ان میں سے بعض کو "دولہ" کا خطاب دے کر امرا اور شرفا کے طبقے میں داخل کر دیا۔ رضی الدولہ جو بریلی کا ایک ڈھاڑی تھا، انیس الدولہ جو آخر میں بادشاہ کے بڑے مہذب مصاحب بن گئے تھے۔ سب اسی قسم کے شریف نما ڈھاڑیوں میں سے تھے۔ لیکن یہ بھی بادشاہ کی قابل تعریف بات ہے کہ خطاب چاہے جیسا اعلیٰ درجہ کا دیا ہو دربار سرکار کی کوئی خدمت یا داروغگی کبھی کسی ڈھاڑی کو نہیں دی۔

جن ڈھاڑیوں کی بادشاہ تک رسائی تھی وہ وہی تھے جو موسیقی میں پورا کمال رکھتے تھے۔ بلکہ کسی ڈھاڑی کے صاحب کمال ہونے کے ثبوت میں یہی کافی تھا کہ بادشاہ کے یہاں نوکر ہے۔

کلکتہ میں ایک بڑا مشہور اور ہر دلعزیز گویا تھا۔ دنی خاں۔ اس کی آواز اس بلا کی تھی کہ جو سنتا ششدر رہ جاتا کلکتے کی بنگالی صحبت ہائے موسیقی میں اس کی بڑی قدر تھی۔ ایک رات مٹیا برج کے کسی رئیس کے وہاں وہ گا رہا تھا۔ اس کی آواز بادشاہ کے کان تک پہنچی تو بے تاب ہو گئے۔ فوراً بلوا کے سنا اور بہت خوش ہوئے مگر فرمایا "صرف گلا اچھا ہے۔ گانا نہیں جانتا" اور پھر اسے اپنے یہاں نوکر نہ رکھا جس کی تمنا اسے مرتے دم تک رہی۔

○

مضامین آزاد

(مولانا ابوالکلام آزاد)

الداء والدواء

یہ بار بار کہا گیا ہے کہ عالم اسلامی کے گذشتہ آخری مصائب نے مسلمانوں میں تنبہ و اعتبار کے جیسے غیر معمولی علائم و آثار پیدا کر دیئے ہیں ان کا پہلے وجود نہ تھا۔ اس قسم کے آراء و قیاسات ہمیشہ مظنون اور مستقبل کے نتائج کے محتاج ہوتے ہیں اور ان کی صحت اور عدم صحت کے دلائل منٹوں اور لمحوں کے واقعات سے متغیر ہو جاتے ہیں۔

وہ قدیر و حکیم جو ایک چھوٹے سے بیج کو ایک عظیم الشان نباتاتی ہستی تک پہنچاتا ہے صرف اس کے ہاتھ میں ہے کہ بیداریوں کو استوار، عبرتوں کو نتیجہ خیز اور متحرک نقشوں کو حی و قائم کی صورت بدل دے۔ یہ علائم فطریہ اور آثار طبیعہ جو تم کو دنیا میں اپنے باہر نظر آتے ہیں بعینہٖ تمہارے اندر موجود ہیں۔ تم جو اس عالم صورت و جسم کے ذرے ذرے کی پرستش کرتے ہو بھول گئے ہو کہ ایک اقلیم قلب و معنی ہے اور اس " عالم صغیر میں جو کچھ ہے اسی عالم کبیر کا عکس ہے۔

سر روحانیاں داری ولے خود را ندید ستی
بخواب خود در آتا قبلۂ روحانیاں بینی

آفتاب طلوع ہوتا ہے اور اپنے سایہ کو اپنے ساتھ متحرک کرتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے چاند نکلتا ہے اور عروج و محاق کی منزلیں طے کرتا ہوا نظر آتا ہے موسم بدلتے ہیں اور نئی نئی ہوائیں چلتی ہیں سمندروں میں طوفان اٹھتے ہیں اور آسمان پر بجلیاں چمکتی ہیں جب کہ موسم خشک اور گرم ہوتا ہے تو بارش کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں اور جب علامتوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو بارش کا نزول ہوتا ہے۔

غرض کہ جو دنیا تمہارے سامنے موجود ہے وہ طلوع و غروب عروج و محاق، تسلط و تنزع، تضارب و تصادم، تجاذل و تسابق، تسخل و ترقی، تبدل و تجدد اور ایاب و ذھاب کا ایک یکسر مرقع ہے جس کے مناظر متلون اور امثال متحرک ہیں۔

بعینہ یہی حال دنیا کا بھی ہے جو تمہارے سامنے نہیں مگر تمہارے اندر موجود ہے۔ وہاں بھی طلوع و غروب ہوتا ہے اور جب کہ تاریکی چھا جاتی ہے تو آفتاب دریچۂ ظلمت سے اپنا سر نکالتا ہے۔ وہاں بھی موسم بدلتے ہیں اور ہوائیں متغیر ہوتی ہیں۔ بہار عیش حیات کا پیغام لاتی ہے اور خزاں افسردگی و ہلاکت کے ساتھ ظہور کرتی ہے۔ وہاں بھی سمندروں میں طوفان اٹھتے ہیں اور زمینوں پر تند و تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ جب موسم بدل جاتا ہے تو یہاں کے آسمان کی طرح وہاں کا آسمان بھی بدل جاتا ہے اور جب پانی برسنے کے لئے آتا ہے تو پہلے ابر کے محیط ٹکڑوں اور سرد ہواؤں کے مرطوب جھونکوں کو بھیج دیتا ہے۔ قحط اور خشک سالی اس سرزمین کی سب سے بڑی مصیبت سمجھی جاتی ہے لیکن وہاں بھی اس سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت نہیں۔ جب آسمان اپنی دریانوائی کا اور زمین اپنی بخشش کا دروازہ بند کر دیتی ہے تو دریا اتر جاتے ہیں اور سیر حاصل زمین خشک ہو کر چٹیل میدان بن جاتی ہے پھر بربادی اور موت دنیا پر چھا جاتی ہے اور انسان اپنی غذا سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی حال وہاں کا بھی ہے البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں جسم کے لیے موت ہے جس کے بعد بھی زندگی باقی رہتی ہے اور وہاں دل کے لیے ہلاکت ہے جس ہلاکت کے بعد زندگی کا کوئی سامان نہیں۔

جسم و جان، رنگ و بو، لفظ و معنی، صورت و حقیقت یہی دو مختلف دنیائیں اور موجود و مشہور کی دو اقلیمیں ہیں۔ جن کو لسان الہی "عالم آفاق و النفس" سے تعبیر کرتا ہے اور یہی وہ عالم معنوی ہے جس کے آثار و علائم اور آیات و اسرار پر قرآن کریم توجہ دلاتا ہے۔

پس گو آثار و علائم ہمیشہ مظنون اور مستقبل کا چہرہ ہمیشہ تاریکی میں ملفوف ہوتا ہے تاہم علامتوں کے ظہور میں شک نہیں۔ عالم اسلامی آج ایک آخری انقلاب

کے کنارے پر ہے اور تبدیلیوں کی وہ تمام علامتیں اس کے چپے چپے میں موجود ہیں جو دنیا کے گذشتہ سخت سے سخت انقلاب کی تکمیل سے پہلے ہمیشہ ظاہر ہوا کی ہیں۔ وہ انقلابات عظیمہ جنھوں نے دنیا اور دنیا کے مناظر کو یکسر پلٹ دیا۔ وہ تغیرات مدہشہ جنھوں نے قوموں اور ملکوں کی تاریخ یک قلم الٹ دی۔ وہ جنھوں نے زمین کے جغرافیہ اور اس کی خشکی اور تری کے حدود میں تبدیلیاں کر دیں۔ وہ جنھوں نے انسانی نسلوں کے عمران وتمدن ان کے عوائد و خصائل کی عمارتوں کو ڈھا کر پھر از سر نو تعمیر کر دیا اور وہ جو اس لیے ظاہر ہوتے ہیں تاکہ حیات و ممات امم کے قانون الٰہی کے مطابق زمین اور زمین کے بسنے والوں کو از سر تا پا بدل دیں ٹھیک ٹھیک ایسے ہی مظاہر و آثار کو اپنے آگے اور یمین و یسار رکھتے تھے جیسے کہ آج کی دنیا کے سامنے ظاہر ہو رہی ہیں۔ یہ دنیا میں ہمیشہ ہو چکا ہے اور ایسا ہونا انقلاب امم و ملل کے ایک دائمی قانون کے ماتحت ہے۔

منجملہ علائم و آثار مخصوصہ کے ایک علامت یہ ہے کہ رفتہ پر ماتم اور آئندہ کی حیرت کی جگہ اب بہت سے دماغ ہیں جو کام بھی کرنا چاہتے ہیں اور محض ماتم و فریاد پر قانع نہیں۔

یہ احساس عام ہے اور عالم اسلامی کے دیگر اکناف و اطراف سے قطع نظر خود ہندوستان میں بھی باوجود استیلائے یاس و قنوط موجود ہے اور اگر صحیح وسائل اختیار کر لئے تو فی الحقیقت انقلاب حالت کا اسے پہلا بیج سمجھنا چاہیے۔ کل کی فکر آج ہر شخص کے سامنے ہے۔ کل تک مصائب کے درد کا خوف تھا۔ اس لیے صرف ذہن و دماغ ہی ان کو محسوس کر سکتے تھے مگر آج جب وہ ظاہر ہو چکے ہیں اور بقیہ ظہور سامنے ہے تو ان کو سمجھنے کے لیے دماغ کی نہیں بلکہ دیکھنے کے لیے آنکھوں کی ضرورت ہے اور دماغ کم ہوں مگر آنکھوں کی کمی نہیں۔

کچھ تو مایوس ہیں اور کچھ متلاشی مگر جیسا کہ مختصراً اشارہ کر چکا ہوں آج کسی قدر تفصیل کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ سفر کا تہیہ ہی مطلوب نہیں بلکہ صحیح راہ سفر کا معلوم کرنا اور پھر اس پر چلنا دونوں باتیں شرط کار ہیں۔

آج اس بارے میں بلند ترین حد نظر اور فکر و جستجو کا آخری سدرۃ المنتہیٰ جو لوگوں کے سامنے ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ حفظ اسلام و مقامات مقدسۂ اسلامیہ کے نام سے ایک وسیع اور عظیم الشان فنڈ جمع کیا جائے اور ہر مسلمان عہد کرے کہ کعبۂ معظمہ کی حفاظت کو وہ ہمیشہ پیش رکھے گا۔

اس میں شک نہیں کہ زمین کی دولت اور تاج و تخت کی حکومت میں جو کچھ ہمارے پاس باقی رہا تھا۔ وہ ہماری غفلتوں اور نادانیوں کی نذر ہو گیا اور جو باقی ہے ہر آن اور ہر لمحہ وہ خطرے میں ہے۔ اور اب اگر کوئی متاع آخری رہ گئی ہے تو صرف اسلام کا مبداء اولیٰ اور دعوت الٰہی کا وہ اولین سرچشمہ ہے جہاں "فاران" کی چوٹیاں ہیں۔ جس پر "سعیر" کے بعد خداوند خدائے سینا نے کتاب شریعت اور شمشیر عدل کے ساتھ ظہور کیا۔ جہاں وہ محترم و مقدس "غار" ہے جس کی تاریکی میں "داعی الی اللہ و سراج منیر" کی روشنی سب سے پہلے نمودار ہوئی تھی اور جو دعوت اسلامی اور ملت حنیفہ کے اس اولین داعی کی یادگار ہے جس نے اپنے نفس و جان کی قربانیوں کا اسوۂ حسنہ دکھلا کر حقیقت اسلامی کی پہلی بنیاد رکھی تھی۔

پس ضرور ہے کہ ہر مسلم ہستی اس کی خدمت گزاری کی راہ میں اپنے تئیں قربان کر دینے کا حلف اٹھائے۔

یہ سب کچھ سچ ہے اور اس سے کسی طرح انکار نہیں لیکن سوال یہ ہے جو ضرورت ہمارے سامنے ہے اور جس لیلیٰ کے فراق میں مجنوں صفتان عشق کی یہ بے قراریاں ہیں کیا اس کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے جو سوال ان کاموں کے شروع کرنے کا سبب تھا۔ مشکل یہ ہے کہ اختیار کرنے کے بعد بھی وہی سوال سامنے آجاتا ہے۔

گشت راز دگر آں راز کہ افشا می کرد

مدتوں مجھ کو صرف مشغول آہ و بکا رہنے کا الزام دیا گیا کئی ماہ سے لوگ معترض ہیں کہ صدا اٹھ رہی ہے مگر مدعا کا پتہ نہیں۔ اس کے اسباب سے تفصیلی بحث کبھی نہ کبھی ہو رہے گی اور غالباً مضمون کے آخر میں کروں مگر یہاں صرف اس

قدر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ خاموشی بے وجہ نہ تھی یاراں راہ نے منزل مقصود کی جستجو کو جتنا آسان سمجھ رکھا ہے شاید اس قدر آسان نہیں ہے۔

بیاں کہ مسئلۂ عشق ازاں دقیق تر است
کہ حل شود شرف از فکر باطل ہمہ کس

پھر کہتا ہوں کہ یہ سب شاخیں ضرور ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جڑ کہاں ہے۔ باغ بہانے کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ درختوں کی شاخوں پر پچکاری سے پانی دیجئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جڑ کو تر و تازہ کیجئے آپ کو پتہ معلوم نہیں تو ممکن ہے کہ دوسروں کو معلوم ہو۔

تو گل از باغ می خواہی من از گل باغ می جویم
من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

یقیناً حالات نے ہمیں تبلا دیا ہے کہ ضروریات ملی کی غرض سے ایک وسیع "خزینۂ ملی" (نیشنل فنڈ) ضروری ہے لیکن صرف اس سے ان آنے والے مصائب کو کیوں کر دور کیا جائے گا جو چاروں طرف سے ہم پر امڈنے والی ہیں۔ کیا ملکوں اور قوموں کا انقلاب ایک ایسا معاملہ ہے جس کو ایک دو کروڑ روپیہ بطور رشوت دے کر ہم اپنے حسب مرضی طے کرلیں گے۔ کیا کرایہ کی فوجیں اور کرایہ کا جوش لندن اور برلن میں ملتا ہے کہ جب کبھی کوئی فوج بلاد اسلامیہ پر حملہ آور ہوگی تو ہم تار کے ذریعہ اجرت طے کرکے فوراً انھیں میدان کی طرف روانہ کردیں گے کیا ہماری تمام بربادیاں اور نامرادیاں صرف اس لیے ہیں کہ ہم نے اپنے پاس روپیہ جمع نہ رکھا اور کیا یورپ نے صرف افلاس کا الزام رکھ کر ہم سے سلانیک اور ایڈریانوپل لے لیا۔

ہمارے سامنے آج ہمارا زوال ہے۔ ہم اپنی تجہیز و تکفین کا سامان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے پاس اب اتنی مہلت نہیں کہ بار بار نسخے آزمائیں اور بہت سے طبیبوں سے رجوع کریں۔ ہم کو اس وقت صرف ایک ہی نسخے کی ضرورت ہے اور صرف ایک ہی طبیب کی۔ ہمارے امراض یقیناً بے شمار ہیں اور فرصت ہوتی تو ایک ایک کا علاج کرتے۔ مگر اب تو اسی نسخہ کی تلاش ہی پر انحصار زندگی اور امید صحت ہے جو ایک ہو مگر اپنے اندر ہمارے تمام بے شمار امراض کا علاج رکھتا ہو۔

چند ہم عصر

(ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

گدڑی کا لال - نور خاں

لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں۔ اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی ایک شان ہے

نور خاں مرحوم کنٹجنٹ کے اول رسالے میں سپاہی سے بھرتی ہوئے۔ انگریزی افواج میں حیدر آباد کی کنٹجنٹ خاص حیثیت اور امتیاز رکھتی تھی۔ ہر شخص اس میں بھرتی نہیں ہو سکتا تھا۔ بہت دیکھ بھال ہوتی تھی۔ بعض اوقات نسب نامے تک دیکھے جاتے تھے تب کہیں جا کر ملازمت ملتی تھی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ صرف شرفا اس میں بھرتی کیے جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ کنٹجنٹ والے عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ قید بھی اُٹھ گئی اور اس میں اور انگریزوں کی دوسری فوجوں میں کوئی فرق نہ رہا۔ پہلے زمانے میں سپہ گری بہت معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ اب اُس میں اور دوسرے پیشوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ اشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔ ان میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے، جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ ہر کوئی اس کی قدر نہیں کر سکتا۔ اس لیے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔ کرنل نواب افسر الملک بہادر بھی نور خاں مرحوم ہی کے رسالے کے ہیں۔ کنٹجنٹ کے بہت سے لوگ اکثر تو کرنل صاحب موصوف کے توسط سے اور بعض اور

ذرائع سے حیدرآباد ریاست میں آکر ملازم ہو گئے۔ ان میں بہت سے نواب، کرنیل، میجر، کپتان اور بڑے بڑے عہدے دار ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کوئی نور خاں بھی ہے؟

اول رسالے کے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ خاں صاحب مرحوم فوج میں بڑی آن بان سے رہے اور سچائی اور فرض شناسی میں مشہور تھے۔ یہ ڈرل انسٹرکٹر تھے یعنی گوروں کو جو نئے بھرتی ہو کر آتے تھے ڈرل سکھاتے تھے۔ اس لئے اکثر گورے افسروں سے واقف تھے وہ بڑے شہسوار تھے۔ گھوڑے کو خوب پہچانتے تھے۔ بڑے بڑے سرکش گھوڑے جو پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے تھے۔ انہوں نے درست کیے۔ گھوڑے کے سدھانے اور پھیرنے میں انہیں کمال تھا۔ چونکہ بدن کے چھریرے اور ہلکے پھلکے تھے گھڑ دوڑوں میں گھوڑے دوڑاتے اور اکثر شرطیں جیتتے تھے۔ ان کے افسران کی مستعدی، خوش تدبیری اور سلیقے سے بہت خوش تھے لیکن کھرے پن سے وہ اکثر اوقات ناراض ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے کمانڈنگ افسر نے کسی بات پر خفا ہو کر جیسا کہ انگریزوں کا عام قاعدہ ہے انہیں ڈیم کہہ دیا۔ یہ تو گالی تھی خاں صاحب کسی کی ترچھی نظر کے بھی روادار نہ تھے۔ انہوں نے فوراً رپورٹ کر دی۔ لوگوں نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے اور آگے نہ بڑھے مگر خاں صاحب نے ایک نہ سنی۔ معاملے نے طول کھینچا اور جنرل صاحب کو لکھا گیا۔ کمانڈنگ افسر کا کورٹ مارشل ہوا اور اس سے کہا گیا کہ خاں صاحب سے معافی مانگے۔ ہر چند اس نے بچنا چاہا مگر پیش نہ گئی۔ اور مجبوراً اسے معافی مانگنی پڑی۔ ایسی خودداری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دفعداری سے آگے نہ بڑھے۔

اچھے برے ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ شریف افسر خاں صاحب کی سچائی، دیانت اور جفاکشی کی بہت قدر کرتے تھے اور ان کو اپنی اردلی میں رکھتے تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے جن کے سر میں خناس سمایا ہوا تھا۔ انہیں خاں صاحب کے یہ ڈھنگ پسند نہ تھے اور ہمیشہ ان کے نقصان کے درپے رہتے تھے۔ ایسے لوگ اپنی اور قوم والوں کی خودداری کو تو جوہر شرافت سمجھتے ہیں لیکن اگر یہی جوہر کسی دیسی میں ہوتا ہے تو اسے غرور اور گستاخی پر محمول کرتے ہیں۔ تاہم ان کے بعض انگریز افسران پر بہت مہربان تھے۔ خاص کر کرنل فرنٹین ان پر

بڑی عنایت کرتے تھے۔ اور خاں صاحب پر اسقدر اعتبار تھا کہ شاید ہی کسی اور پر ہو۔ جب کرنل صاحب نے اپنی خدمت سے استعفا دیا تو اپنا تمام مال و اسباب اور سامان جو ہزارہا روپے کا تھا خاں صاحب کے سپرد کر گئے۔ یہ امر انگریزوں کو بہت ناگوار ہوا۔ اس وقت کے کمانڈنگ افسر سے نہ رہا گیا اور اس نے کرنل موصوف کو خط لکھا کہ "آپ نے ہم پر اعتماد نہ کیا اور ایک دیسی دفعدار کو اپنا تمام قیمتی سامان حوالے کر گئے۔ اگر آپ یہ سامان ہمارے سپرد کر جاتے تو اُسے اچھے داموں فروخت کر کے قیمت آپ کے پاس بھیج دیتے۔ اب بھی اگر آپ لکھیں تو انتظام ہو سکتا ہے" کرنل نے جواب دیا کہ مجھے نور خاں پر تمام انگریز افسروں سے زیادہ اعتماد ہے آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس پر یہ لوگ اور برہم ہوتے۔ ایک بار کمانڈنگ افسر یہ سامان دیکھنے آیا اور کہنے لگا کہ فلاں فلاں چیز ہیم صاحب نے ہمارے ہاں سے منگائی تھی چلتے وقت واپس کرنی بھول گئے، اب تم یہ سب چیزیں ہمارے بنگلے پر بھیج دو۔ خاں صاحب نے کہا میں ایک چیز بھی نہیں دوں گا۔ آپ کرنل صاحب کو لکھیے وہ اگر مجھے لکھیں گے تو مجھے دینے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ وہ اس بات پر بہت بگڑا اور کہنے لگا تم ہمیں جھوٹا سمجھتے ہو؟ خاں صاحب نے کہا میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، یہ سامان میرے پاس امانت ہے اور میں کسی کو اس میں سے ایک تنکا بھی دینے کا مجاز نہیں۔ غرض وہ بڑبڑاتا ہوا کھسیانا ہو کر چلا گیا۔ خاں صاحب نے ایک انگریزی محرر سے اس سامان کی مکمل فہرست تیار کرائی اور کچھ تو خوش خرید پر کچھ نیلام کے ذریعہ بیچ کر ساری رقم کرنل صاحب کو بھیج دی۔

نہ معلوم یہی کرنل تھا یا کوئی دوسرا افسر، جب ملازمت سے قطع تعلق کر کے جانے لگا تو اس نے ایک سونے کی گھڑی، ایک عمدہ بندوق اور پانچسو روپے نقد خاں صاحب کو بطور انعام یا شکرانے کے دیئے۔ خاں صاحب نے لینے سے انکار کیا۔ کرنل اور اس کی بیوی نے بہتیرا اصرار کیا مگر انہوں نے سوائے بندوق کے دوسری کوئی چیز نہ لی اور باقی سب چیزیں واپس کر دیں۔

کرنیل اسٹورٹ بھی جو ہنگولی چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر تھے۔ ان پر بہت مہربان

تھے۔ رسالے کے شریف انگریز ان سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے بعد انگریز افسر تم کو بہت نقصان پہنچائیں گے۔ وہ ان کی روش سے خوش نہ تھے اور خوش کیوں کر ہوتے، خوشامد سے انھیں چڑ تھی اور غلامانہ اطاعت آتی نہیں تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اپنے کرنل کے ہاں کھڑے تھے کہ ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا، گھوڑے پر سے اتر کر اس نے خاں صاحب سے کہا کہ گھوڑا پکڑو۔ انہوں نے کہا سائیس نہیں ہوں۔ اس نے ایسا جواب کاہے کو سنا تھا۔ بہت چین بہ جبین ہوا مگر کیا کرتا۔ آخر باگ درخت کی شاخ سے اٹکا کر اندر چلا گیا۔ اب نہ معلوم یہ خاں صاحب کی شرارت تھی یا اتفاق تھا کہ باگ شاخ میں سے نکل گئی اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ اب جو صاحب باہر آئے تو گھوڑا ندارد۔ بہت جھنجلایا۔ بڑی مشکل سے تلاش کر کے پکڑوایا تو جگہ جگہ سے زخمی پایا۔ اس نے کرنل صاحب سے خاں صاحب کی بہت شکایت کی۔ معلوم نہیں کرنل نے اس انگریز کو کیا جواب دیا لیکن خاں صاحب سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ تم نے خوب کیا۔

خاں صاحب نے یہ رنگ دیکھا تو خیر اسی میں دیکھی کہ کسی طرح وظیفہ لے کر الگ ہو جائیں۔ وہ بیمار بن گئے اور ہسپتال میں رجوع ہوتے۔ کرنل اسٹوارٹ نے ڈاکٹر سے کہہ کر ان کو مدد دی اور اس طرح وہ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر کی رپورٹ پر وظیفہ لے کر فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں بعض وقت اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔

کرنل اسٹوارٹ نے بہت چاہا کہ مسٹر ڈنکن ناظم پولس سے سفارش کر کے انھیں ایک اچھا عہدہ دلادیں مگر خاں صاحب نے اسے قبول نہ کیا اور کہا کہ میں اب اپنے وطن دولت آباد ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ صوبے دار صاحب اورنگ آباد سے سفارش فرمادیں تو بہت اچھا ہو۔ کرنل صاحب بہت اصرار کرتے رہے کہ دیکھو تمہیں پولیس میں بہت اچھی خدمت مل جائے گی انکار نہ کرو مگر یہ نہ مانے۔ آخر مجبور ہو کر نواب مقتدر جنگ بہادر صوبے دار صوبۂ اورنگ آباد سے سفارش کی۔ صوبے دار کی عنایت سے وہ قلعہ دولت آباد کی جمعیت کے جمعدار ہو گئے اور بہت خوش تھے۔

نواب مقتدر جنگ کے بعد بشیر نواز جنگ اورنگ آباد کی صوبے داری پر آئے۔ وہ بھی خاں صاحب پر بہت مہربان تھے۔ اسی زمانے میں لارڈ کرزن والسرائے دولت آباد تشریف لائے۔ خاں صاحب نے سلامی دینے کی تیاری کی۔ کئی توپیں ساتھ ساتھ رکھکر سلامی دینی شروع کی۔ لارڈ کرزن گھڑی نکال کر دیکھ رہے تھے۔ جب سلامی ختم ہوئی تو نواب صاحب سے خاں صاحب کی بہت تعریف کی۔ سلامی ایسے قاعدے اور اندازے سے دی کہ ایک سیکنڈ کا فرق نہ ہونے پایا۔ نواب صاحب نے اس کا تذکرہ خاں صاحب سے کیا اور کہا میاں اب تمہاری خیر نہیں معلوم ہوتی۔

لارڈ کرزن جب قلعہ کے اوپر بالا حصار پر گئے تو وہاں ستانے کے لیے کرسی پر بیٹھ گئے اور جیب سے سگرٹ دان نکال کر سگرٹ پینا چاہا۔ دیا سلائی نکال کر سگرٹ سلگایا ہی تھا کہ یہ فوجی سلام کر کے آگے بڑھے اور کہا کہ یہاں سگرٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگرٹ نیچے پھینک دیا اور جوتے سے رگڑ ڈالا۔ یہ حرکت دیکھ کر نواب بشیر نواز جنگ بہادر اور دوسرے عہدداروں کا رنگ فق ہوگیا۔ مگر موقع ایسا تھا کہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ لہو کے سے گھونٹ پی کے چپ رہ گئے۔ بعد میں بہت کچھ لے دے کی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ خاں صاحب نے قاعدے کی پوری پابندی کی تھی اس میں چوں وچرا کی گنجائش نہ تھی۔

اب اسے اتفاق کہیئے یا خاں صاحب کی تقدیر کہ لارڈ کرزن نے جانے کے بعد ہی فنانس کی معتمدی کے لیے مسٹر واکر کا انتخاب کیا۔ ریاست کے مالیے کی حالت اس زمانے میں بہت خراب تھی۔ مسٹر واکر نے اصلاحیں شروع کیں۔ اس لپیٹ میں قلعۂ دولت آباد بھی آگیا۔ اوروں کے ساتھ خاں صاحب بھی تخفیف میں آگئے

دولت آباد میں ان کی کچھ زمین تھی۔ اس میں باغ لگانا شروع کردیا۔ مسٹر واکر دورے پر دولت آباد آئے تو ایک روز ٹہلتے ٹہلتے ان کے باغ میں بھی آپہنچے۔ خاں صاحب بیٹھے گھاس کھرپ رہے تھے مسٹر واکر کو آتے دیکھا تو اٹھ کر سلام کیا۔ پوچھا کیا حال ہے؟ کہنے لگے آپ کے جان ومال کو دعا دیتا ہوں۔ اب آپ کی

بدولت گھاس کھودنے کی نوبت آگئی۔ مسٹر واکر نے کہا یہ تو بہت اچھا کام ہے۔ دیکھو تمہارے درخت انجیروں سے کیسے لدے ہوئے ہیں۔ ایک ایک آنے کو بھی ایک انجیر بیچو تو کتنی آمدنی ہو جائے گی۔ خاں صاحب گھبرائے کہیں ایسا نہ ہو کہ کم بخت انجیروں پر بھی ٹیکس لگا دے۔ تڑ سے جواب دیا کہ آپ نے انجیر لدے ہوئے تو دیکھ لیے اور یہ نہ دیکھا کہ کتنے سڑ گل کر گر جاتے ہیں کتنے آندھی ہوا سے گر پڑتے ہیں، کتنے پرند کھا جاتے ہیں اور پھر ہماری دن رات کی محنت۔ مسٹر واکر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر سراج الحسن صاحب اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بلا کے مردم شناس ہیں تھوڑی ہی دیر میں اور چند ہی باتوں میں آدمی کو ایسا پرکھ لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ پھر جیسا وہ آدمی کو سمجھتے ہیں دیسا ہی نکلتا ہے۔ کبھی خطا ہوتے نہیں دیکھی۔ ڈاکٹر صاحب ایسے قابل جوہروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ فوراً ہی اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب کا برتاؤ ان سے بہت خبر گیرانہ اور دوستانہ تھا نواب برزور جنگ اس زمانے میں صوبے دار تھے۔ مقبرے کا باغ ان کی نگرانی میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سفارش کر کے باغ سے پانچ روپے ماہانہ الاونس مقرر کرا دیا۔

نواب برزور جنگ کے پاس ایک گھوڑا تھا وہ اسے بیچنا چاہتے تھے۔ کلب میں کہیں اس کا ذکر آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا مجھے گھوڑے کی ضرورت ہے۔ میں اسے خرید لوں گا۔ مگر پہلے نور خاں کو دکھالوں۔ وہاں سے آکر ڈاکٹر صاحب نے خاں صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا بھئی اس گھوڑے کو دیکھ آؤ، کوئی عیب تو نہیں۔ خاں صاحب نے کہا آپ نے غضب کیا میرا نام لے دیا۔ گھوڑے میں کوئی عیب ہوا تو میں چھپاؤں گا نہیں اور صوبے دار صاحب مفت میں مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تم خواہ مخواہ وہم کرتے ہو۔ کل جا کے ضرور گھوڑا دیکھ لو۔ خاں صاحب گئے گھوڑا نسل کا تو اچھا تھا مگر پانچوں شرعی عیب موجود تھے۔ انھوں نے صاف صاف آکے کہہ دیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے خریدنے سے انکار کر دیا۔ صوبے دار صاحب

آگ بگولا ہو گئے۔ دوسرے روز مقبرے میں آتے۔ باغ کا رجسٹر منگایا اور نور خان کے نام پر اس زور سے قلم کھینچا کہ اگر لفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اٹھتے۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو بہت افسوس کیا مگر انھوں نے اس کی تلافی کر دی۔ یہ سن کر صوبیدار صاحب اور بھی جھنجلائے۔

ڈاکٹر صاحب ترقی پا کر حیدر آباد چلے گئے۔ ان کی خدمت کا دوسرا انتظام ہو گیا کچھ دنوں بعد ڈاکٹر صاحب ناظم تعلیمات ہو گئے اور میں ان کی عنایت سے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر اورنگ آباد آیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی نے مجھے نور خاں سے ملایا اور ان کی سفارش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں عارضی طور پر اپنے دفتر میں محرر کر دیا۔ وہ مدرسی اور محرری تو کیا کرتے مگر بہت سے مدرسوں اور محرروں سے زیادہ کار آمد تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب باغ کی نگرانی میرے حوالے کی تو خاں صاحب کا الاؤنس جاری ہو گیا۔

اعلیٰ حضرت واقدس بعد تخت نشینی اورنگ آباد رونق افروز ہوئے تو یہاں کی خوش آب و ہوا کو بہت پسند فرمایا اور عظیم الشان باغ لگانے کا حکم دیا۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب کے سپرد ہوا۔ اور ان سے بہتر کوئی یہ کام کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے آخر اس باغ کے عملے میں خاں صاحب کو بھی ایک اچھی سی جگہ مل گئی جو ان کی طبیعت کے مناسب تھی۔ اور آخر دم تک وہ اسی خدمت پر رہے اور جب تک دم میں دم رہا اپنا کام بڑی محنت اور دیانت داری سے کرتے رہے۔

یوں محنت سے کام تو اور بھی کرتے ہیں لیکن خاں صاحب میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو بڑے بڑے لوگوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ سچائی بات کی اور معاملے کی ان کی سرشت میں تھی۔ خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے، وہ سچ کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ اسی میں انھیں نقصان بھی اٹھانے پڑے مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے مستعد ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ دن ہو رات ہو ہر وقت کام کے لیے تیار۔ اکثر دولت آباد سے پیدل آتے جاتے تھے۔ کسی کام کو کہیے تو ایسی خوشی سے کرتے تھے کہ کوئی اپنا کام بھی اس قدر خوشی سے نہ کرتا ہوگا۔ دوستی کے بڑے

پکے اور وضعدار تھے۔ چونکہ ادنیٰ اعلیٰ سب ان کی عزت کرتے اس لیے ان سے غریب دوستوں کے بہت کام نکلتے تھے۔ ان کا گھر مہمان سرائے تھا۔ اورنگ آباد کے آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف ان کے گھر پہنچ جاتے، اور وہ ان سے بہت خوش ہوتے تھے۔ بعض وقت جو مسافر بنگلے میں آکر ٹھیر جاتے تھے ان کی بھی دعوت کر دیتے تھے۔ بعض اوقات ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ ان کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اس قدر قلیل معاش ہونے پر ان کی یہ مہمان نوازی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان کی بیوی بھی ایسی نیک بخت تھی کہ دفعتاً مہمانوں کے پہنچ جانے سے کبیدہ خاطر نہ ہوتی بلکہ خوشی خوشی کام کرتی اور کھلاتی تھی۔ خوددار ایسے تھے کہ کسی سے ایک پیسے کے روادار نہ تھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن ہر چند طرح طرح سے ان کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے تھے مگر وہ ٹال جاتے تھے۔ مجھ سے انھیں خاص انس تھا میں کوئی چیز دیتا تو کبھی انکار نہ کرتے۔ کبھی کبھی خود فرمائش کرتے تھے۔ مٹھاس کے بیحد شائق تھے۔ ان کا قول تھا کہ اگر کسی کو کھانے کو میٹھا ملے تو نمکین کیوں کھائے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ نمکین کھانا مجبوری سے کھاتا ہوں مجھ میں اگر استطاعت ہو تو ہمیشہ مٹھاس ہی کھایا کروں اور نمکین کو ہاتھ نہ لگاؤں۔ انھیں مٹھاس کھاتے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اکثر جیب میں گڑ رکھتے تھے۔ ایک بار میرے ساتھ دعوت میں گئے، قسم قسم کے تکلف کے کھانے تھے۔ خاں صاحب نے چھوٹتے ہی میٹھے پر ہاتھ ڈالا۔ ایک صاحب جو دعوت میں شریک تھے۔ یہ خیال کرکے کہ خاں صاحب کو دھوکا ہوا ہے کہنے لگے کہ حضرت یہ میٹھا ہے مگر انھوں نے کچھ پروا نہ کی اور برابر کھاتے رہے۔ جب وہ ختم ہوگیا تو دوسرے میٹھے پر ہاتھ بڑھایا۔ ان صاحب نے پھر ٹوکا حضرت یہ میٹھا ہے انھوں نے کچھ جواب نہ دیا اور اسے بھی ختم کر ڈالا۔ جب کبھی وہ کسی دوست کے ہاں جاتے تو وہ انھیں ضرور میٹھا کھلاتے اور یہ خوش ہو کر کھاتے۔

خاں صاحب بہت زندہ دل تھے۔ چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔ جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان، بوڑھوں میں بوڑھے

تھے۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے، اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ ان سے ملنے اور باتیں کرنے سے غم غلط ہوتا تھا۔ آخر دم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔

ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کبھی اورنگ آباد آتے تو اسٹیشن سے اترتے ہی اپنا روپیہ پیسہ سب ان کے حوالے کر دیتے اور سب خرچ انہی کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔ جانے سے پہلے ایک روز قبل وہ حساب لے کر بیٹھتے۔ بعض وقت بدہ نہ ملتی تو آدھی آدھی رات تک لیے بیٹھے رہتے تھے۔ ہر چند ڈاکٹر صاحب کہتے کہ خاں صاحب یہ تم کیا کرتے ہو۔ جو خرچ ہوا ہوا باقی جو بچا دے دو یا زیادہ خرچ ہوا ہو تو لے لو۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ جب تک حساب ٹھیک نہ بیٹھتا انہیں اطمینان نہ ہوتا۔ چلتے وقت کہتے لیجئے صاحب یہ آپ کا حساب ہے۔ اتنا خرچ ہوا اور اتنا بچا۔ کچھ زیادہ خرچ ہو جاتا تو کہتے کہ اتنے پیسے خرچ ہیں یہ ہمیں دلوائیے کبھی ایسا ہوا کہ انھیں شبہ ہوا تو جانے کے بعد پھر حساب لے بیٹھتے اور خط لکھ کر بھیجتے کہ اتنے آنے آپ کے رہ گئے تھے وہ بھیجے جاتے ہیں یا اتنے پیسے میرے زیادہ خرچ ہو گئے تھے وہ بھیج دیجے گا۔ ڈاکٹر صاحب ان باتوں پر بہت جھنجھلاتے تھے مگر وہ اپنی وضع نہ چھوڑتے تھے۔ وہ حساب کے کھرے۔ بات کے کھرے، اور دل کے کھرے تھے وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ ان کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا۔ اور ان کی مستعدی کو دیکھ کر دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی۔ اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا [illegible] آدمی تھا۔ تو میں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش! ہم میں بہت [illegible] تے!!

چند ہم عصر

(ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

نام دیو۔ مالی

نام دیو مقبرۂ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے اس کا تھالولا صاف کر رہا ہے۔ تھالولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا۔ پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اپنا کام چھوڑ کر

اسے دیکھا کرتا۔ مگر اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا۔ اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کر دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑی فکر ہوتی۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لا کر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اسے علاج کے لیے بلا لے جاتے بلا تامل چلا جاتا، مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا تھا اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے روشیں باقاعدہ، تھالے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر۔ جھاڑنا بہارنا صبح و شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم خاں فیضی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی

ہے ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے، یا بیڑی پینے لگے۔ یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باؤلیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے اور جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ اور وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انہیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھونڈ ڈھونڈ کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا۔ یوں سمجھئے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا، کیسی ہی تنگی ترشی ہو، وہ تو ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوق باغبانی مشہور تھا۔ مقبرۂ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا، وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکاڑ سے پٹا پڑا تھا آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز و شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اچھی

پر کھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے۔ اسے مقبرہ سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگران کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے، ٹوکیو سے، جاپانی، طہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اُپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا اس نے نہ فن باغبانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام مہاکاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سیندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سیندھی شراب پیتا، یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں اسے شہادت نصیب ہوئی۔

بہت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی اس پر اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا۔ اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ وہ دن رات برابر کام کرتا رہا لیکن اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں جانوروں پودوں کی خدمت کرتا۔ لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اس وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کوئی نیک

کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے ہیں ساری نیکی اور برائی ہے درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی عبادت کا محتاج نہیں وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا۔ اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور برائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا

○

خطبات عبدالحق

اُردو کی تاریخ

گری زون سوستان ایک پرگنہ ہے اور پہاڑی علاقہ ہے اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں قدیم سے ایک روایت مشہور چلی آرہی ہے کہ "خلاق عالم نے فرشتہ کلمائیل کو بیجوں بھرے تھیلے دیے اور فرمایا کہ جاؤ تم دنیا کا ایک چکر لگاؤ اور زبانوں کے یہ بیج لوگوں کے سروں میں بوتے چلے جاؤ" فرشتے نے ارشاد خداوندی کی تعمیل کی اور بیج بنی نوع انسان کے دماغوں میں جم گئے اور فوراً اُگنے شروع ہوئے اور زبانیں چشمے کی طرح ابلنے لگیں۔ جب فرشتہ کلمائیل اپنے تھیلے خالی کرچکا اور خلاق عالم کے پاس واپس آنے کو ہوا تو یہ دیکھ کر اسے سخت ندامت اور پریشانی ہوئی کہ گری زون کا علاقہ چھٹ گیا ہے۔ اس نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں اس فروگزاشت کے متعلق عرض کیا۔ خدا نے مختلف تھیلوں کے ملے جلے بیج جو بچ رہے تھے اسے دیئے اور کہا کہ "جاؤ یہ وہاں جاکر بو آؤ"۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہاڑی آبادی میں طرح طرح کی بولیاں اور زبانیں پائی جاتی ہیں"۔

یہ نقل بہ نسبت گری زون کے ہندوستان پر زیادہ صادق آتی ہے جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں، جن کی تعداد بیسوں نہیں سیکڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن اس ہجوم میں ایک زبان ایسی بھی نظر آتی ہے جو ملک کے اکثر علاقوں میں بولی جاتی ہے اور تقریباً ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ زبان ہندوستانی یا اردو ہے جس کا ادب نظم و نثر میں نویں صدی ہجری سے مسلسل موجود ہے۔ یہ ہمارا ہی دعویٰ نہیں بلکہ اس کی شہادت غیروں نے بھی دی ہے اور یہ شہادتیں یورپی سیاحوں کی تحریروں میں سترھویں صدی

کی ابتدا سے بعد تک برابر ملتی ہیں۔

ایک موقع پر کسی خاص معاملے میں ابی سینیا کے سفیر خوجہ سے چند استفسارات کیے گئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ "فلاں شخص نے آپ کی حضوری میں کس زبان میں گفتگو کی؟" وہ جواب دیتے ہیں "ہندوستانی زبان میں" جس کی ترجمانی دیر اکیلینسز دی ہائی گورنمنٹ آف بٹاویا کے سکریٹری نے کی۔

یہ واقعہ ۱۶۹۷ء کا ہے۔ اس زمانہ کا سیاح لکھتا ہے کہ "دربار کی زبان تو فارسی ہے مگر عام بول چال کی زبان "اندستان" ہے"۔ (فراتر)

یہ اگلی باتیں ہیں انھیں جانے دیجیے۔ کمپنی کے زمانے کو لیجیے جب ایسٹ انڈیا نے اپنا کاروبار یہاں جمایا اور تجارت سے سیاست کی طرف قدم بڑھایا تو تجارت اور سیاست دونوں اغراض کی خاطر تازہ ولایت نوکار انگریز ملازموں کی تعلیم کے لیے ملک کی ایک ایسی زبان کا انتخاب کیا جو اپنی عام مقبولیت اور وسعت کی وجہ سے سب سے زیادہ کارآمد تھی۔ یہ زبان ہندوستانی یعنی اردو تھی۔ اس کے لیے ایک بڑا مدرسہ قائم کیا گیا جو فورٹ ولیم کالج کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں قابل زبان داں ہندی ملازم رکھے گئے جو نوجوان نوواردوں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم بھی دیتے تھے اور کتابیں بھی تالیف اور ترجمہ کرتے تھے۔ اس کالج کے معلم اول ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو اردو کے محسن اور اس کے شیدائیوں میں تھے اس زبان کو گرانڈ پاپولر اسپیچ آف انڈیا کہتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ وہ اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ "یہ نہایت کارآمد اور عام زبان ہے۔ جس پر ہندوستان فخر کر سکتا ہے وہ اپنی اسی کتاب برٹش انڈیا مونی ٹر میں لکھتے ہیں کہ "چونکہ ہندوستانی، ہندوستان کی سب سے زیادہ عام زبان ہے اور جو ہمیں شب و روز اپنے دیسی افسروں، مدرسوں، ملازموں اور دیگر متعلقین سے گفتگو کرنے میں استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے نحوی اصول کے ساتھ اسے جس قدر جلد سکھا یا جائے اسی قدر بہتر ہے"۔ (۲)

(۱، ۲)

اس زبان کی تعلیم کے متعلق گورنمنٹ کے احکام نقل کرنے کے بعد وہ ان برٹش افسروں اور دیگر اصحاب کے نام ایک پیام بھیجتا ہے جو ہندوستان آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ پیام یہ ہے۔ " جب سے متذکرۂ بالا احکام نافذ ہوئے ہیں بنگال گورنمنٹ نے بنگال، مدراس اور بمبئی کے ملکی اور فوجی علاقوں کے لیے مشرقی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا ہے ان سب میں ہندوستانی بجا طور پر مقدم اور اہم خیال کی گئی ہے اور اس لئے تمام رائٹروں اور کیڈٹوں کو ہندوستان پہنچنے پر سکھائی جاتی ہے۔ ہندوستانی زبان کا علم برٹش انڈیا میں نہ صرف ہر ایک ایسے اجنبی کے لیے لازم ولابد ہے جو عام طور پر اہل ملک سے ذاتی تعلقات رکھتا ہے۔ بلکہ اس سے فارسی اور دوسری مشرقی زبانوں کی تحصیل کا رستہ بھی کھل جاتا ہے۔ جہاں وہ ہندوستانی کے ذریعہ سے جو ہندوستان کے باشندوں اور خصوصاً منشیوں یا دیسی سوداگروں کی دیسی زبان ہے ان مقامی قدیم زبانوں کو بہت جلد سیکھ لیتا ہے۔

بحری اور بری فوج میں نیز ہندوستان کے خانگی معاملات میں کسی زبان کا ایسا عام رواج نہیں جیسا ہندوستانی کا ہے اور کیڈٹوں کو جو فوجی اکیڈمیوں میں اسے پڑھتے ہیں یا فوجی تعلیم حاصل کرتے ہیں کسی اور زبان کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ اکیڈمیاں بنگال مدراس اور بمبئی میں قائم کی گئی ہیں۔

جس طرح یورپ میں ایک تعلیم یافتہ شخص کے لیے بعض جدید اور قدیم زبانوں کا علم مفید اور موجب زینت سمجھا جاتا ہے اسی طرح ہندوستان میں سنسکرت فارسی، عربی وغیرہ کا علم بھی وہی درجہ رکھتا ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں ہر شخص کے لیے ہندوستانی کا جاننا ایسا ہی ناگزیر ہے جیسا کہ انگلستان والوں کے لیے انگریزی کا جاننا اور اسی لیے ان حضرات کا جو ایسٹ انڈیز کو آنا چاہتے ہیں سب سے زیادہ ضروری اور بڑا وصف یہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ دیر سویر ان پر صاف کھل جائے گا کہ ہندوستانی کے مقابلے میں یہ علمی زبانیں دوسرے درجہ پر ہیں اور بعد میں یہ زبانیں اس ملک میں زیادہ آسانی اور کم خرچ میں سیکھی جا سکتی ہیں۔

اگر یہ دلیل انگلستان وبیرون انگلستان کے چند سالانہ تجربے کی بنا پر معروف و مسلم

واقعات پر مبنی ہے تو ملک بجا طور پر یہ امید رکھتی ہے کہ "ہرفورڈ" اور "مارلو" کے سول اور ملٹری کالجوں کے شعبوں میں ہندوستانی زبان کی تعلیم ان طلبہ کے لیے جو ہندوستان آنا چاہتے ہیں سب سے مقدم خیال کی جائے گی کیونکہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے انگلستان کے جج اور سول اور ملٹری کے عہدہ دار خواہ وہ کیسے ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہوں وہ ہمارے ملک میں اپنے عہدوں کے بالکل نا اہل ثابت ہونگے اگر وہ ہماری مادری زبان نہیں جانتے۔ اسی طرح ہندوستان میں ہندوستانی کا وہی درجہ ہے جو انگریزی کا برطانیہ یا ترکی کا اس کی سلطنت میں۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جو راہ چلتا بھی سمجھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں مدراس کے ایک انگریز افسر کا خط بھی نقل کیا ہے جس کا مفصلہ ذیل اقتباس پڑھنے کے قابل ہے (خط ۱۹ جون ۱۸۰۲ء کا لکھا ہوا ہے) "ہندوستانی بولی کے متعلق میرا کچھ کہنا غیر ضروری ہے کیونکہ اس کی وسعت اور قوت ان تمام اشخاص پر کافی طور سے آشکارا ہے جن کا تعلق ہندوستان کے کاروبار یا ادب سے ہے۔ میری رائے میں صرف اس بولی کا معقول علم اس گورنمنٹ کے علاقوں کے ہر حصے کے لیے بالکل کافی ہے۔ نواب آف ارکاٹ کے تمام علاقوں اور ٹیپو سلطان کی مملکت بالا گھاٹ میں ہندوستانی سے وہ سب اشخاص واقف ہیں جو سرکاری دفاتر میں مامور ہیں، نیز عام لوگوں کی بڑی تعداد اس زبان کو جانتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب اپنی ایک اور تصنیف "ایسٹ انڈیا گائڈ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف اضلاع اور صوبوں میں خاص خاص بولیاں بولی جاتی ہیں۔ لیکن ہم جرأت کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ فرداً فرداً دیکھا جائے تو ان میں کوئی بھی عام طور پر ایسی مفید اور ضروری نہیں جیسی ہندوستانی۔

اب ہم اس دعوے کی تائید میں چند دلائل پیش کرتے ہیں جو بلا شبہ اس کی صداقت کا تشفی بخش اور دل نشین ثبوت ہوں گے۔

ہندوستان کے وسیع ملک میں شاید ہی کوئی ایسا مسلمان پایا جائے گا جو مقامی اور ذاتی حالات یعنی خاندانی و تعلیمی وغیرہ کے لحاظ سے کم و بیش شستگی اور خوبی سے ہندوستانی زبان نہیں بولتا یا نہیں سمجھتا۔ نیز ہر شریف ہندو یا وہ جس کا ذرا سا بھی تعلق کسی حکومت

یا برٹش گورنمنٹ سے ہے اپنے منصب اور حیثیت کے لحاظ سے ضرور اس زبان سے کچھ نہ کچھ واقف ہے

علاوہ اس کے یہ مشترک ذریعہ ہے جس کے توسط سے اہل ملک عموماً اور متعدد غیر ملکوں کے اکثر باشندے جو اس ملک میں بس گئے ہیں اپنی ضرورتوں اور خیالات کا ایک دوسرے پر اظہار کرتے ہیں۔ اس بیان کی صداقت کی تائید میں، ہم خود ایک شہادت ہیں اور ہماری طرح پرتگالی، ولندیزی (ڈچ)، فرانسیسی، ڈین، عرب، ترک، یونانی (گریک) ارمنی، گربی، ایرانی مغل اور چینی بھی ہیں جو اکثر باہم ہندوستانی میں بات چیت کرتے ہیں کیوں کہ ان کی اپنی زبانوں کے مقابلے میں ہندوستان کی یہ لنگوافرینکا زیادہ سہولت بخش ہے ہندوستان کی تمام فوجوں میں یہ زبان عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اگرچہ افواج کے اکثر افراد اپنی اپنی حکومتوں، علاقوں، صوبوں اور اضلاع کی بولیوں کو مادری زبان کی حیثیت سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

تقریباً کیپ کامورن سے لے کر کابل تک سارا ملک جو طول میں دو ہزار میل اور عرض میں ۱۴۰۰ میل ہے اس میں جہاں جہاں گنگا بہتی ہے شاید ہی کسی بڑے گاؤں، قصبے یا شہر میں جسے مسلمانوں نے فتح کیا یا جہاں مسلمان آباد ہیں کوئی ایسا شخص ملے گا جو اچھی خاصی طرح ہندوستانی نہ جانتا ہو اور گنگا سے بھی بہت پرے نیز مشرقی جزائر کے سواحل پر بھی یہ زبان رائج ہے اور اس قدر معروف ہے کہ بہت آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے۔

اگرچہ ہندوستان میں نثر کی بہت سی کتابیں مثلاً تاریخی یا علمی تالیفات نہیں ہیں تاہم بہت سے شستہ قصے اور دل کش نظمیں موجود ہیں عام طور پر خانگی، تجارتی اور فوجی اور نہایت اہم سیاسی معاملات کے متعلق مراسلت اسی زبان میں کی جاتی ہے۔ اور اس موقع پر ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ دیسی علما کا درس اور مضامین ادب پر ان کی تمام بحثیں اور دلائل اسی زبان میں کی جاتی ہیں اور ہر حالت میں یہ دیکھا گیا ہے، جب کبھی ہندوستان کا کوئی باشندہ اپنے کسی خیال یا مضمون کو کسی دوسری زبان میں لکھنا یا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو قبل اس کے کہ وہ اسے فارسی مکتوب کے طور پر لکھے یا کوئی سیاسی تحریر قلم بند کرے وہ ہمیشہ

اپنے خیالات کو ہندوستانی میں ترتیب دیتا ہے اور اپنا مفہوم اسی زبان میں ادا کرتا ہے۔

اگر یہ تمام بیانات اور دلائل صداقت پر مبنی ہیں تو ان کی قوت کو کون چیز کمزور کر سکتی ہے۔ اوپر کے صغریٰ کبریٰ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سوداگر، سیاح، وکیل، ملا یا پادری فلسفی، طبیب غرض ہر شخص کے لیے جو ہندوستان میں کسی قسم کا بھی کوئی کام کر رہا ہے یا یہاں امن وخوشی سے رہنا چاہتا ہے ہندوستانی زبان بہ نسبت کسی دوسری زبان کے عموماً نہایت ضروری اور مفید ہے اور اس اعتبار سے سب سے مقدم اسی کا سیکھنا ہے اور اس کے بعد بوجہ ان اعلیٰ فوائد کے جو اسے باقی دوسری زبانوں کے مقابلے میں بدرجہ اتم حاصل ہیں یہ نہایت درجہ قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے"۔ کول برد ک جو بڑے عالم گزرے ہیں "ایشیاٹک ریسرچز" کی ساتویں جلد میں لکھتے ہیں کہ "یہ شستہ زبان جو ہندوستان اور دکن کے ہر حصے میں بولی جاتی ہے یا جو تعلیم یافتہ دیسیوں نیز ہندوستان کے بہت سے صوبوں کے ناخواندہ لوگوں میں باہمی گفتگو کا مشترک ذریعہ ہے اور جسے تقریباً ہر جگہ نیز ہر گاؤں کے اکثر باشندے سمجھتے ہیں"۔

ڈاکٹر گلکرسٹ نے اپنے ایک شاگرد رشید کا خط نقل کیا ہے جو بہت دل چسپ اور حقیقت افروز ہے۔ اس کے کاتب مشہور مسٹر مٹکاف ہیں جو اس وقت دلی کے اسسٹنٹ رزیڈنٹ کیا دلی کے آقا ہو گئے تھے۔ یہ خط ۱۸۰۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں اردو کی کیا حیثیت اور وقعت تھی۔ وہ لکھتے ہیں "میرا خیال ہے میں آپ کو اس معاملے کے بارے میں قابل اطمینان اطلاع مہیا کر سکتا ہوں جس کے متعلق آپ کو قدرتی طور پر تشویش ہے۔

"ہندوستان کے ہر حصہ میں جہاں جہاں میں ملازمت کے سلسلہ میں رہا یعنی کلکتے سے لاہور کے قرب وجوار تک اور کوہستان کمایوں سے نربدا تک افغانوں، راجپوتوں، جاٹوں، سکھوں اور مختلف اقوام میں جو ان ممالک میں آباد ہیں۔ میں نے سفر کیا ہے میں نے اس زبان کا عام رواج دیکھا جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی۔ یوں کہنے کو بہت بولیاں اور لہجے ہیں۔ اپنی بات سمجھانے یا دوسرے کی سمجھنے کے لیے اکثر بہت صبر کی ضرورت ہوتی ہے

ہے۔ ہمارے کان ہمیشہ ان آوازوں سے آشنا نہیں ہوتے جو ہم سنتے ہیں۔ اول اول دلیسی لوگ ہمارے لہجے اور ڈھنگ کو بغیر بار بار دھرائے نہیں سمجھتے۔ یہ دقت اکثر مقامات پر واقع ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں ذاتی تجربے نیز اطلاعات کی بنیاد پر جو مجھے دوسروں سے حاصل ہوئی ہیں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں کیپ کامورن سے کشمیر تک اور آوا سے دریائے سندھ کے دھانے تک پیدل چلا جاؤں تو مجھے ہر جگہ ایسے لوگ ملیں گے جو ہندوستانی بول سکتے ہیں۔ میرے کہنے کا یہ منشا نہیں کہ میں ایسے لوگ مطلق نہ پاؤں گا جو یہ زبان نہیں بول سکتے، کیونکہ ظاہر ہے کہ اس وسیع خطے میں جس کا میں نے ذکر کیا ہے مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں بلکہ ایسا نہ ہو تو تعجب ہے۔ لیکن ہندوستانی ہی وہ زبان ہے جو عام طور پر کار آمد ہے اور میری رائے میں اسے وہ عام وسعت حاصل ہے جو دنیا کی کسی زبان کو حاصل نہیں۔ میں ابھی اس زبان میں کچا ہوں لیکن جس قدر میرا جہل زیادہ ہے اسی قدر میری شہادت قوی ہے اور جہاں تک میری شہادت کا تعلق ہے ہندوستانی کا بول بالا رہے گا۔ میرے خیال میں دنیا خاص طور پر آپ کی رہین منت ہے اور اسے آپ کی ان پر جوش مخلصانہ کوششوں کے لیے آپ کا شکرگذار ہونا چاہیے جو آپ نے مشرقی ادب کی اس نہایت اہم شاخ کی اشاعت و ترقی میں فرمائی ہیں۔'

زباں داں اردو ہے ایسا کہ آج
ہے قالون ہندی کو اس سے رواج

میں نے جو کسی قدر طویل اقتباسات پڑھ کر سنائے ہیں اس سے میرا منشا یہ جتانا تھا کہ اردو زبان خاص کر اٹھارویں صدی کے اخیر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں اپنی مقبولیت اور عالم گیری میں سب پر سبقت لے گئی تھی اور یہ رفتار اس کی برابر جاری رہی چنانچہ موسیو دیوپان نے جو فرانسیسی انسٹیٹیوٹ کے رکن اور سینٹ کے ممبر اور فاضل شخص تھے اپنی کتاب "اقوام کی قوت پیدائش" میں ایک باب ہندوستانیوں کے متعلق لکھا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "برطانوی ہند کی مردم شماری سرکاری کاغذات کے مطابق اس وقت ۲۸ کروڑ ۰ لاکھ ہے۔ آپ کو معلوم رہنا چاہیے کہ ان میں تقریباً ۲۰

کروڑ نفوس کے درمیان جو چیز ایک مشترک رشتے کا کام دیتی ہے وہ اردو زبان ہے یہ زبان پورے یورپ کے برابر رقبے کی سرزمین میں بولی جاتی ہے" (۱)

گارساں دتاسی جو اردو زبان کے پروفیسر اور عالم اور اس کے بڑے حامی تھے اور جنھوں نے اپنے زمانے میں اردو کی یادگار خدمت کی اور ایسی عمدہ کتابیں لکھیں اور زبان کے متعلق ایسی قابل قدر معلومات مہیا کیں جو کوئی اہل زبان بھی اپنی زبان میں نہ کر سکا ۱۸۶۵ء کے خطبے میں کہتے ہیں۔ "بہر نہج لوگوں کا خیال ہندوستانی کی نسبت کچھ ہی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ سارے ہندوستان کی مشترک زبان بن گئی ہے۔ دن بدن جو اس کی ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جا سکتی ہے۔ اس مسئلے کی نسبت کپتان ایچ مورنے جو مرکزی حکومت میں ترجمان کی خدمت پر فائز ہیں اپنی رائے سے مجھے ان الفاظ میں مطلع کیا ہے۔

"بلاشبہ کچھ عرصے کے بعد ہندوستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کرلے گی۔ اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ریل کی وجہ سے جو اندرون ملک میں ہزارہا میل کی مسافت میں پھیل گئی ہے ہندوستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کو بھی ملنے جلنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہندوستانی زبان اس مقصد کو بطریق احسن پورا کرتی ہے اس لیے کہ اس کی ساخت میں ہندی، فارسی، عربی کے عنصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے مقاصد پورے کرے میرے خیال میں ہندوستان کے قدرتی وسائل کی ترقی کے جس قدر امکانات ہیں اسی قدر ہندوستانی زبان کو فروغ حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں"۔ (۲)

یہ وہ زمانہ ہے کہ اردو مقبول خاص و عام تھی اور اس کی مقبولیت کا ناقابل تردید

---

(۱) - خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۳۶۵۔

(۲) - خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۴۵۸ - ۱۸۶۵ء -

ثبوت یہ ہے کہ ۱۸۳۵ء کے بعد جب فارسی کے بجائے اردو دفتری زبان قرار دی گئی تو کوئی آواز اس کے خلاف سننے میں نہیں آئی اور کسی نے یہ نہ کہا کہ اردو نہیں فلاں فلاں زبان ہونی چاہیئے۔ اس کی یہ متفقہ مقبولیت ایک مدت تک برابر جاری رہی۔ چنانچہ گارساں دتاسی بمبئی گزٹ مورخہ ۲ فروری ۱۸۶۱ء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "بنگال، بہار اور اڑیسہ کے زمینداروں اور دوسرے باشندوں نے والئرائے گورنر جنرل بہادر کو ایک عرضداشت بھیجی جس میں یہ درخواست کی کہ جدید ہائی کورٹ میں کاروائی اردو زبان میں ہونی چاہیئے۔ اس زمانے میں بمبئی کی نئی نئی یونیورسٹی قائم ہوئی تھی۔ ۱۸۶۰ء کے ڈگری کے امتحان میں اردو زبان بھی تھی۔ اور اس کے نصاب میں باغ و بہار، اخلاق، مثنوی میر حسن اور دیوان ناسخ شریک تھے"[۱]

یہ وہ زمانہ تھا کہ ان صوبوں کے ہندو تعلیم یافتہ اور اہل قلم جہاں زبان اردو تھی نیز انگریز مدبر اور حاکم تک عام جلسوں میں اردو میں تقریریں کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء میں مہاراجہ کشمیر کی گدی نشینی کے موقع پر جموں میں جو دربار ہوا اس میں مسٹر ڈیوس جو اس موقع پر گورنمنٹ ہند کے نمائندہ تھے جب نئے راجہ کے سینے پر تمغہ لگا چکے تو مہاراجہ نے ان کی تقریر کا جواب اردو میں دیا۔

سر جے پی گرانٹ لفٹننٹ گورنر بنگال جب یورپ واپس جا رہے تھے تو اہل کلکتہ نے ۲۶ اپریل ۱۸۶۱ء کو ان کے اعزاز میں ایک عام جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسے کے صدر راجا کانت دیو بہادر تھے۔ انھوں نے اس موقع پر اردو میں تقریر کی۔ ان کے بعد راجا کالی کشن بہادر نے جو مشہور مصنف گزرے ہیں تقریر کی وہ بھی اردو میں تھی۔ نیز ایک جلسے میں سر جان گرانٹ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنے کی تحریک ہوئی جو متفقہ طور پر منظور کی گئی۔ اس جلسے میں راجا اپروا کرشن نے اردو میں تقریر کی اور یہ تجویز پیش کی کہ کلکتہ میں سر جان گرانٹ کا بت نصب کیا جائے۔ اسی طرح کلکتے کے ایک اور جلسے میں جو اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ انگلستان کے کپڑے کے کارخانے کے مزدوروں سے اظہار

---

[۱] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۳۲۷۔

ہمدردی کیا جائے مختلف مقرروں نے ہندوستانی میں تقریریں کیں اور راجا ؛ اپن سنگھ نے اس جلسے میں تجاویز کی تائید اردو میں کی ؂

شاہزادہ ویلز کی شادی کے موقع پر ہندوستان میں ہر جگہ جلسے منعقد ہوئے اور ان میں ہندوستانی زبان میں تقریریں کی گئیں۔ فروری ۱۸۶۲ء میں جب سرہنری منٹگمری گورنر پنجاب ریاست کپورتھلہ تشریف لے گئے تو اس موقع پر صاحب موصوف نے مشن اسکول کے طلبہ کے سامنے ہندوستانی میں تقریر کی۔ جنوری ۱۸۶۷ء میں پنجاب کے لفٹننٹ گورنر نے اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا جس میں مختلف ہندوستانی راجا اُمرا اور سرکاری عہدہ دار شریک تھے۔ لفٹنٹ گورنر نے اس موقع پر انگریزی میں نہیں اردو میں جلسے کو خطاب کیا۔

جب سرجانس لارنس وائسرائے کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے تو انھوں نے ایک بڑا شاندار دربار آگرے میں منعقد کیا جب وائسرائے تخت پر بیٹھنے کے لیے تشریف فرما ہوئے۔ تو توپوں کی سلامی دی گئی اور ولیم میور نے شاہی فرمان کا ترجمہ پڑھا اور خود وائسرائے نے حاضرین کے روبرو ہندوستانی میں تقریر کی۔

برٹش انڈیا ایسوسی ایشن مراد آباد میں لفٹننٹ گورنر نے اردو میں تقریر کی نیز مدرسۂ مراد آباد کے افتتاح کے موقع پر بھی صاحب موصوف نے اردو ہی میں جلسے سے خطاب کیا مہاراجہ بنارس نے ۱۸۶۸ء میں چیمبرز انسائیکلوپیڈیا کے اردو ترجمے کے لیے دس ہزار روپے منظور کیے بشرطیکہ حکومت بھی دس ہزار دے۔

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اردو کی مقبولیت کے کیا اسباب ہیں۔ دوسرے ہندی اور اردو کے اختلاف کا مسئلہ کیوں کر پیدا ہوا؟

میں پہلے سے دوسرے سوال کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ بعض اصحاب کا جو یہ خیال ہے کہ سرسید احمد خاں نے انڈین نیشنل کانگریس سے مخالفت کرکے ہندی اردو کا اختلاف پیدا کیا سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ فساد ... سے اول ۱۸۶۷ء میں بنارس

؂ ۔ خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۳۷۔

سے اٹھا جہاں بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا "جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے"

ہندوؤں کی اس قومی مجلس میں جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جابجا اس کے لیے کمیٹیاں مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہو گئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں تھیں۔[۱]

اس کے بعد سے یہ جھگڑا مختلف صورتوں میں طرح طرح سے اب تک چلا آرہا ہے۔ جس کی تاریخ اور تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ میں یہاں صرف مختصر طور پر اس کے اصل وجوہ پر غور کرنا چاہتا ہوں۔

پہلے زمانے میں آج کل کی طرح زبان سیاست کے دنگل میں نہیں اتری تھی۔ لوگ جس زبان میں زیادہ سہولت دیکھتے یا جس زبان میں اشاعت کا زیادہ سامان پاتے اس میں لکھتے تھے۔ اور اکثر اہل قلم اپنی زبان ترک کر دیتے اور غیر زبان میں لکھنا پسند کرتے تھے۔ ایک زمانے میں لاطینی سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھی۔ اور بعض جرمن اور انگریز مصنفین لاطینی زبان میں تالیف و تصنیف کرتے تھے۔ اس میں کسی حکومت کا دباؤ نہ تھا بلکہ اپنے شوق سے کرتے تھے اور انھیں کبھی اس کا گمان تک نہ ہوتا تھا کہ ایسا کرنا قومیت یا وطنیت کے حق میں غداری ہے۔

فریڈرک اعظم اگرچہ جرمن تھا لیکن فرانسیسی بولنے کو ترجیح دیتا تھا اور فرانسیسی لکھتے یا بولتے وقت اس کے خیال میں بھی کبھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ کسی ایسے فعل کا ارتکاب کر رہا ہے جو اس کے جذبۂ قومیت کے منافی ہے۔ یا ہمارے ملک کی مثال لیجئے جب انگریزی تعلیم کا رواج ہوا تو ہمارے ہم وطن تعلیم یافتہ اکثر انگریزی میں بات چیت

---

[۱] حیات جاوید صفحہ ۱۷۰۔

اور خط و کتابت کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں اگرچہ پہلا سا خبط اب نہیں رہا۔ جنھیں توفیق ہوتی ہے انگریزی میں تصنیف و تالیف بھی کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کا کوئی قانون ایسا نہیں کہ سوائے انگریزی کے کسی دیسی یا دوسری زبان میں تالیف نہ کی جائے۔ لوگ یہ سب کچھ اپنے شوق سے کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حال مغلوں کی حکومت میں تھا جب کہ یہاں فارسی کا رواج ہوا۔ مغلوں کی حکومت میں ہندوستان کی کایا بدل گئی۔ وہ اس ملک میں اپنے ساتھ نئے آئین اور نئے اصول حکمت اور نیا مذہب لائے، انھوں نے نئی تنظیم اور حکمت کو رواج دیا اور نئے تمدن اور تہذیب اور نئی معاشرت کا دور شروع ہوا، نئے آداب مجلس، نئے رسم و رواج اور نئے ذوق نے رواج پایا۔ ان کے ساتھ طرح طرح کے کپڑے، قالین اور فرش و فروش، سامان آرائش، نئے آلات جنگ، نئے پھول اور پھل اور نئے قسم کے کھانے، نئی قسم کی صناعی، نئی قسم کی اصطلاحات اور الفاظ یہاں آئے انہوں نے یہاں کے حالات میں ایک عجیب تغیر پیدا کر دیا اور سارے ماحول میں ایک نیا رنگ روپ نظر آنے لگا۔ اس جدید ذوق اور اس جدید تہذیب اور جدید خیالات کے ادا کرنے کے لیے جو اس ماحول میں جاری تھے سوائے فارسی کے کوئی دوسری زبان نہ تھی۔ ایک تو اس لیے کہ اس زبان میں شیرینی، لچک، وسعت تھی، الفاظ و اصطلاحات کا ذخیرہ موجود تھا، اور بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے بیان کے سانچے تیار تھے۔ دوسرے اس میں لکھنے سے تحریر اہل بصیرت اور اصحاب ذوق کی نظر سے گزرتی تھی اور ہندوستان ہی میں نہیں اس سے باہر بھی پہنچتی تھی۔ اور تحسین حاصل کرتی تھی۔ چو تھے اس میں کسی قدر مشیخت کا بھی شائبہ تھا۔ اس میں ہندو مسلمان سب برابر تھے دونوں کی تحریریں پڑھیے ذرہ برابر فرق نہیں پایا جاتا۔ یہ اس لیے نہیں کہ مغلوں نے فارسی سیکھنے کے لیے جبر کر رکھا تھا۔ ان کے عہد میں علم اور زبان کی بڑی عام آزادی تھی بلکہ انھوں نے سنسکرت اور دوسری دیسی زبانوں کی سرپرستی کی جس کی وجہ سے انھیں بہت فروغ ہوا۔ چنانچہ ان کے عہد میں سنسکرت کے اعلیٰ مصنف اور سنسکرت اور ہندی کے بہت سے نامور شاعر ہوئے ہیں۔ فارسی کی طرف یہ عام رجحان جدید حالات اور ماحول کا نتیجہ تھا۔ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے اکثر ممالک میں زبان کے معاملے میں اکثر رواداری کا برتاؤ تھا اور لوگ غیر زبان بولنے

اور غیر زبان لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔

لیکن یہ آزادی اور رواداری دنیا میں زیادہ مدت تک نہیں رہی ایک زمانہ آیا کہ جب مذہب اور عقیدے کی طرح زبان بھی سیاسی لپیٹ میں آگئی۔ جرمنوں نے فرانسیسیوں کی نفرت کی وجہ سے فرانسیسی اور دوسری زبانوں کے الفاظ اپنی زبان سے اسی طرح خارج کرنے شروع کر دیئے جس طرح آج وہ یہودیوں کو اپنے ملک سے جلاوطن کر رہے ہیں۔ اسی طرح شیواجی کے زمانے میں مرہٹی زبان سے عربی فارسی کے الفاظ نکال دینے کی کوشش کی گئی۔ آئرلینڈ میں محض انگریزی کی مخالفت میں آئرش زبان کے زندہ کرنے کی جدوجہد جاری ہے۔ ترکوں نے اپنی زبان سے غیر زبانوں کے لفظ نکالنا شروع کر دیئے ہیں۔ ایران میں پہلے بھی ایک کوشش ہوئی لیکن ناکام رہی۔ اب وہ پھر ترکوں کی طرح غیر زبانوں کے الفاظ نکال دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ زبان کے لیے اب لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں، دوسری زبانوں کو مٹانے اور فنا کرنے کے لیے جابرانہ احکام اور آئین نافذ کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ شہروں اور مقاموں تک کے نام بدل دیئے جاتے ہیں۔

زبان اور قومیت اب تک ایک دوسرے کا جزو لاینفک سمجھے جاتے ہیں اور جب اس کے ساتھ مذہب بھی آشریک ہوتا ہے تو یہ بادۂ تلخ دو آتشہ ہو جاتی ہے۔

یہی صورت ہندوستان میں پیش آئی ۱۸۵۷ء کے بعد کمپنی بہادر برخاست ہوئی، انگریزی راج آیا، حالات نے پلٹا کھایا، جدید قانون نافذ ہوتے، جو آگے تھے پیچھے اور جو پیچھے تھے آگے ہو گئے۔ چند ہی سال بعد قومیت کا خیال جو سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا اڑتا ہوا یہاں بھی پہنچا۔ ریل اور تار کی حیرت انگیز اختراعوں، کالجوں کی تعلیم، آزادی اور حب وطن کی تقریروں اور تحریروں، انگریزی انصاف پسندی کے اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبہ کو اکسایا خاص کر ہندو اس [illegible] دور کو اپنے حق میں آزادی کا دور سمجھے۔ اس کے ساتھ [illegible] قومیت اور [illegible] نے فخر نے بھی دلوں میں نیا جوش پیدا کیا جسے میکس مولر نے ابھارا اور جس سے بعد میں اینی بزانٹ نے خوب کام لیا۔ لیکن سب سے زیادہ مستحکم طور پر یہ خیال سوامی دیانند سرسوتی نے دلوں میں جمایا۔ گروکل قائم ہوئے جن میں سنسکرت

پڑھنا اور سنسکرت بولنا لازم تھا۔ ویدک زمانے کی معاشرت کی نقل کی جانے لگی' ننگے پاؤں پھرنا' ایک بے سلی چادر اوڑھنا لپیٹنا' جنگلوں میں رہنا' زیر سما سونا وغیرہ قومی شعار قرار پایا۔ اسی قومیت کے جذبے' مقدس قدامت اور ماضی کے غرور' نام نہاد نئی آزادی اور نئی تعلیم نے اس میں نشے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ طرح طرح سے اپنی نئی حیثیت اور انفرادیت جتانے لگے۔ اور جس طرح ایک بے وقوف عورت نے اپنی خوبصورت انگوٹھی دکھانے کی خاطر گھر کو آگ لگا دی تھی۔ انھوں نے بھی بنے بنائے گھر کو بگاڑنا شروع کیا۔ سب سے پہلے نزلہ اردو زبان پر گرا۔ اس کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ اسلامی عہد کی پیداوار تھی' یہ سچ ہے کہ اس زمانے کے ماحول اور اس تمدن اور تہذیب کی مخلوق تھی جو مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئی اور جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر شریک ہیں اور اردو بنانے میں تو (یہ میرا ذاتی خیال ہے) ہندو شریک غالب تھے اور چونکہ یہ اس ماحول میں پیدا ہوئی جس کی تعمیر ہندو مسلمانوں دونوں کے ہاتھوں سے ہوئی اس لیے اس میں بہ نسبت کسی دوسری ہندی زبان کے عربی' فارسی کے الفاظ زیادہ تھے اور وہ بھی سب ملا کر کتنے بقول مولانا حالی "جتنا آٹے میں نمک"

حیرت ہے کہ آریا اس ملک میں آئیں اور ہندی کہلائیں' مغل' ترک' عرب یہاں آباد ہوں اور ہندوستانی بن جائیں اور بیسیوں قومیں یہاں آئیں اور دیسی بن جائیں لیکن بقول عورتوں کے "جنم جلے" لفظ ہی ایسے ہیں جو صدہا سال رہنے سہنے کے بعد بھی غیر کے غیر ہی رہے اور اپنے نہ ہونے پائے۔ اب انہیں محض اس شبہے پر کرید کرید کر اور اکھیڑ کر نکالنا نادانی نہیں دیوانہ پن ہے۔ قومی غرور میں اکثر ایسا ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بدتر حرکتیں سرزد ہوتی ہیں مثلاً جرمنی نے لفظوں پر مشق کرتے کرتے انسانوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ جب لفظ ہماری زبان پر آ گیا اور رس بس گیا تو وہ غیر زبان کا نہیں رہتا ہمارا ہو جاتا ہے۔ اگر ہم نکال دیں تو سوائے ہماری زبان کے اس کا کہیں ٹھکانا نہیں رہتا۔ دوسری زبان میں مل جانے سے نہ اس کی وہ پہلی سی صورت اور چہرہ مہرہ رہتا ہے اور نہ سیرت و خصلت۔ وہ اگر اپنی اصلی زبان کی طرف جائے گا تو پہچان بھی نہ پڑے گا اور اسے وہاں کوئی گھسنے نہ دے گا۔ اس کے علاوہ اصل زبان کا

اس میں کوئی نقصان نہیں، نقصان ہے تو اس زبان کا جس میں یہ آکر بس گئے تھے اور جن کی وجہ سے اس زبان کی رونق، وسعت اور قوت اظہار میں اضافہ ہو گیا تھا۔

زبان کی یہی گت اس ہندی اردو جھگڑے میں بنی۔ عربی، فارسی ہی نہیں بلکہ ہندی کے معمولی لفظ بھی جو عام طور پر بول چال میں رائج ہیں۔ خارج اور ان کی جگہ سنسکرت کے اصل لفظ داخل کیے جا رہے ہیں۔ یہ زبان کا بنانا نہیں بگاڑنا ہے۔

بعض حضرات نے اس نزاع کا الزام سر سید احمد خاں کے سر تھوپا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جب سر سید نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی تو ہندی اردو کا جھگڑا پیدا ہوا۔ یہ بالکل غلط ہے جب یہ جھگڑا اٹھا ہے اس وقت کانگریس کا وجود بھی نہ تھا، اس کے متعلق خود سر سید کا بیان موجود ہے، ہم اسے کیوں نہ دیکھیں وہ علی گڑھ کی تعلیمی سروے رپورٹ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"تیس برس کے عرصہ سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، خیال پیدا ہوا ہے۔ اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح کی کوشش کریں مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جائے اس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے میں نہایت درستی اور اپنے تجربہ اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اسی سے ہوئی۔"

جیسا کہ میں نے بیان کیا اس کی ابتدا ۱۸۶۷ء میں بنارس میں ہوئی اور ایسے برے وقت ہوئی کہ اب تک ختم ہونے میں نہیں آتی، بلکہ دن بدن زور پکڑتی جاتی ہے۔ لیکن اس وقت بھی بعض منصف مزاج اور عاقبت اندیش ہندو اہل قلم نے اس نئی تحریک کی مخالفت کی۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں منشی حکم چند پروفیسر دہلی کالج نے ایک مدلل اور محققانہ مضمون اس کی مخالفت میں لکھا، پروفیسر موصوف زبانوں کی حقیقت اور ارتقا وغیرہ پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں "میری سمجھ میں

نہیں آتا کہ خالص زبان اور میل والی (مخلوط) زبان میں کیا خاص فرق ہے۔ اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے مقابلے میں کیوں خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی زبان بھی ایسی کہی جا سکتی ہے جس میں بدیسی الفاظ شامل نہ ہو گئے ہوں؟ اگر کوئی ایسی زبان موجود ہو تو اس کو ترجیح کی کوئی وجہ نہیں۔ میل والی زبان میں اجنبی الفاظ کچھ عرصے کے استعمال کے بعد کھپ جاتے ہیں اور مقامی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور اس میل والی زبان کو بھی ہم خالص زبان کہہ سکتے ہیں۔ دراصل یہ تمام امور اردو زبان کی بحث سے خارج ہیں۔ اس واسطے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس قدر زمانے سے ہندوستان میں استعمال کی جا رہی ہے کہ اس کو ترک کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ یہ بحث بالکل بے نتیجہ ہے کہ آیا اردو ایک خالص زبان ہے یا اس میں دوسری زبانوں کا بھی میل ہے۔ اب ہندو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس کی جگہ ہندی کو رواج دیں جس کا استعمال عرصے سے ترک کر دیا گیا ہے اور جس کی حیثیت اب ایسی ہی ہے جیسی سنسکرت کی۔ ایک زمانہ تھا جب دلی والے جامہ پہنا کرتے تھے، لیکن اب لوگوں نے یہ لباس ترک کر دیا۔ اگر کوئی یہ لباس پہن کر بازار میں جائے تو لوگ کیا کہیں گے؟ اکثر بہروپ سے تعبیر کریں گے۔ زبانوں کا یہی حال ہے۔ اب اگر آپ "بدن" کی جگہ شریر اور شیر کی جگہ "سنگھ" استعمال کریں گے تو لوگ آپ کی بات سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ فارسی رسم الخط کی جگہ جو ناگری رسم الخط استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کا بھی یہی حال ہے۔ دراصل ایک دفعہ بدیسی الفاظ کسی زبان میں چل جائیں تو زبان خالص بنانے کے لیے انھیں بے دخل نہیں کیا جا سکتا اور نہ رسم الخط بدلا جا سکتا ہے۔ فردوسی نے شاہنامے میں عربی الفاظ استعمال نہیں کیے لیکن کیا دوسرے فارسی شعرا جیسے خاقانی، انوری، نظامی وغیرہ اس کا تتبع کر سکے؟ برخلاف اس کے ان کے یہاں کثرت سے عربی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس اصول پر ہم اردو عربی، فارسی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں؟ شہروں میں ہر چھوٹا بڑا اردو بولتا ہے۔ سرکاری دفاتر میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اردو میں اخبارات کی بڑی تعداد شائع ہوتی ہے اور تعداد میں ہر روز مزید اضافہ ہو رہا ہے اردو میں دوسری زبانوں کے مطالب بیان کرنے کی بدرجۂ اتم صلاحیت پائی جاتی ہے۔"

اسی زمانے میں گارساں دتاسی لکھتے ہیں کہ "باوجود ان مباحث کے جن کی نسبت ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے مسلم ہے۔ ڈیوک آف اڈنبرا نے اسی زبان میں اپنے دوران سفر میں تقریریں کیں۔ اور اسی زبان میں ڈیوک موصوف کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھے گئے۔ آج کل ساؤتھ کنزنگٹن میوزیم میں شہزادہ البرٹ کی جو نمائش ہو رہی ہے۔ اس کے نیچے اردو زبان میں کتبہ لکھا گیا ہے" اسی مضمون میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں" اگرچہ صوبۂ بنگال کی زبان بنگالی ہے لیکن اردو جیسا کہ میں پیشتر وضاحت بیان کر چکا ہوں وہاں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ راجا کالی کرشن پرشاد نے حال میں ملکہ وکٹوریہ کی سال گرہ کے موقع پر سنسکرت میں جو نظم لکھی تھی اس کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے جس کی ایک نقل انھوں نے مجھے بھی بھیجی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ موصوف نے اس کا بنگالی میں ترجمہ نہیں کیا"۔ پھر لکھتے ہیں" اگر کوئی ہندو اسلامی حکومت کو برا کہے اور انگریزی نظم ونسق کا مداح ہو تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن عربی فارسی اور اردو جیسی زبانوں کے ساتھ تعصب برتنا کسی طرح بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا بابو شیو پرشاد جیسے عالم فاضل شخص سے مجھے یہ توقع نہ تھی" اس لیے ان کی تحریر دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ بابو صاحب خود اردو نہایت عمدہ لکھتے ہیں اور متعدد تصانیف اس زبان میں شائع کر چکے ہیں۔ یہ خواہش کرنا کہ ہندوستان میں سوائے سنسکرت، ہندی یا انگریزی کے اور کسی زبان کی تحصیل ہی نہ کی جائے میرے خیال میں تنگ نظری پر دلالت کرتا ہے۔ میں سید احمد خاں کی طرح اس باب میں زیادہ وسیع مشرب واقع ہوا ہوں"۔

اس زمانے میں اس نئی تحریک پر بڑی گرماگرم بحثیں ہوئیں اور دونوں فریق نے تائید و تردید میں خوب خوب دل کا بخار نکالا۔ اس زمانے کا کوئی اخبار یا رسالہ شاید ہی اس بحث سے خالی ہو۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے یہ بحث دھیمی پڑ گئی اور لوگ سیاسی اور معاشرتی مسائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن سر انٹونی میکڈانل کے عہد جرءت مہد میں اس دبی ہوئی آگ کو پھونکیں مار مار کر سلگا یا گیا۔ اور ابھی کچھ دنوں دم نہ لینے پائے تھے کہ شدھی اور سنگٹھن نے وہ شعلے بھڑکائے جن کی آنچ اب

تک کم نہیں ہوئی ہے اور جو آتا گیا ایک آدھ کپا تیل کا اور لنڈھاتا گیا۔

انگریز بہت خوش اقبال ہے کہ ہر قرن اور ہر دور میں کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل آتی ہے کہ ہم آپس میں کٹ مرتے ہیں اور وہ اس کے مزے لیتا ہے۔

رشید احمد صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ میں ہندی اردو کے قضیے سے بیزار ہوں میں ان سے زیادہ بیزار ہوں میں اب سے پہلے کبھی اس بحث میں نہیں پڑا تھا۔ یہ میرے شعار کے خلاف تھا بلکہ جہاں کبھی میں نے ضرورت سمجھی ہندی کی حمایت کی۔ جامعہ عثمانیہ میں ہندی کے رواج دینے میں تھوڑی سی میری ناچیز کوشش کو بھی دخل تھا۔ تین سال کا ذکر ہے کہ جب مدراس میں بعض پروفیسروں اور دیگر صاحب ذوق اصحاب نے اردو اکاڈیمی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت احاطۂ مدراس میں ہندی کی اشاعت اور پروپیگنڈے کا بھی ذکر آیا تو میں نے بھی کہا کہ ہمیں ہرگز اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے۔ جس قدر ان میں ہندی کا زیادہ رواج ہوگا اسی قدر وہ ہم سے زیادہ قریب ہو جائیں گے، کیونکہ ہندی سے زیادہ ہندوستان کی کوئی زبان اردو سے زیادہ قریب بلکہ اقرب نہیں ہے (افسوس ہے کہ مجھے قریب کا لفظ استعمال کرنا پڑا جس سے دوئی کی بو آتی ہے۔ حالانکہ کچھ پہلے ہماری ایک ہی زبان تھی) لیکن جب میں نے دیکھا کہ واقعات کا خون کیا جا رہا ہے اور دانستہ طرح طرح کی غلط بیانیاں پھیلائی جا رہی ہیں تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے جھجکتے جھجکتے اپنی طبیعت کے خلاف اپنی کم زور اور اس سے بھی کم زور اپنے قلم سے کسی قدر کام لیا۔ مجبوری میں آدمی کو کبھی کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔

حال میں اس معاملے میں دو قسم کی غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ہندی دو ہزار برس سے یہاں جاری ہے اور یہی ہندوستانی زبان ہونا چاہئے۔ ہندی کا لفظ عام ہے اس کا اطلاق برج بھاشا، اودھی، بندیلی، مگھیلی، راجستانی، بھوج پوری، میتھلی، چھتیس گڑھی وغیرہ وغیرہ پر اسی طرح ہوتا ہے جس طرح اردو پر ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک زمانے میں ہندی کہلاتی تھی۔ مگر وہ ہندی جس کی خاطر یہ سارا طوفان برپا کیا گیا ہے اس کی پیدائش کو بقول شخصے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے (خدا ان کی ارواح کو شرمائے) بیٹھے بٹھائے بلاوجہ اور بغیر ضرورت یہ شوشہ چھوڑا۔ للوجی لال نے جو اردو کے زبان داں اور اردو کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ اس کی بنا ڈالی، وہ اس طرح کہ اردو کی بعض کتابیں لے کر انھوں نے ان میں سے عربی، فارسی لفظ چن چن کر الگ نکال دیئے اور ان کی جگہ سنسکرت اور ہندی کے نامانوس الفاظ جما دیئے۔ لیجئے ہندی بن گئی۔ جدید ہندی کی تاریخ سے جو واقف ہیں وہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس کی ابتدا اسی طرح سے ہوئی۔ یہاں میں بخوف طوالت ان رایوں کی نقل نہیں کرنا چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ وہ مشکل ہے اور بھدی ہے۔ فٹز ایڈورڈ ہال جو ایک جید عالم گزرے ہیں۔ اور ہندی زبان کے بڑے حامیوں میں سے تھے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "ہندی زبان جیسی کہ وہ آج کل مستعمل ہے دراصل بالکل جدید زبان ہے اور انیسویں صدی کے خاتمے پر جو ہندی رائج ہوگی وہ بہت مختلف ہو جائے گی"۔

ان کی پیشن گوئی حرف بحرف صحیح نکلی۔

دوسری غلط بیانی یہ کی گئی کہ اردو کو مسلمان بادشاہوں نے حکومت کے زور سے پھیلایا اور اس وقت ہندوؤں نے بحالت مجبوری یا سیاسی مصلحت سے قبول کرلیا۔ یہ بیان سرتاپا غلط اور بے بنیاد ہے۔ بات اگر کوئی اور کہتا تو قابل التفات نہ ہوتی لیکن یہ الفاظ ایسے شخص کے قلم سے نکلے ہیں جو اردو اور ہندی دونوں کا مسلم ادیب تھا۔ وہ اپنے اخلاق اور سیرت کے لحاظ سے معمولی آدمی نہ تھا اس لیے اور بھی زیادہ تعجب اور افسوس ہوتا ہے۔ اردو زبان کی تاریخ ایسی صاف اور کھلی چیز ہے کہ اس پر بحث کرنے یا اس بیان کی تردید کرنے کی مطلق ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مسلمان بادشاہوں کے دربار اور دفتر کی زبان ہمیشہ فارسی رہی۔ ان کو اتنی توفیق ہی نہ ہوئی کہ غریب اردو کی طرف توجہ فرماتے اور توجہ کی بھی تو کس وقت؟ جب نہ سلطنت رہی نہ حکومت۔ ظاہر ہے ایسے وقت میں ان کا اثر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ اردو زبان جدید ہندی کی طرح کسی نے بنائی نہیں۔ وہ تو خود بخود بن گئی۔ اور ان قدرتی حالات نے بنائی جن پر کسی کو قدرت نہ تھی۔ اس میں ہندو

اور مسلمان دونوں شریک تھے اور اگر ہندوؤں کی اس میں شرکت نہ ہوتی تو یہ وجود ہی میں نہیں آسکتی تھی۔ مسلمان بادشاہوں پر یوں تو بہت سے الزام عائد کئے گئے ہیں لیکن یہ بالکل نیا الزام ہے اور حال ہی میں گھڑا گیا ہے۔

حضرات! اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اردو کی مقبولیت کے کیا اسباب ہوئے۔ سب سے بڑی وجہ اس کی مقبولیت عام کی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد عوام کی زبان پر رکھی گئی تھی جو بول چال کی زبان تھی۔ خود اردو کا لفظ ہی اس کی اصل اور ابتدا کا پتا دیتا ہے۔ اس وقت جتنی شائستہ اور اعلیٰ درجے کی زبانیں ہیں جن کی دھاک ساری دنیا پر بیٹھی ہوئی ہے وہ ایک وقت میں عوام کی معمولی بولیاں تھیں اور حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ خود اہل زبان اس میں لکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ بعینہٖ یہی حال پہلے پہلے اردو کا بھی تھا۔ اس کے بولنے والے بھی اس میں لکھتے ہوئے ہچکچاتے تھے اور جو کبھی کوئی لکھتا، اور وہ بھی مذہبی ضرورت سے ہوتا تھا تو پہلے معذرت کرتا کہ چوں کہ سب عربی، فارسی نہیں جانتے اس لیے ان کی خاطر سے اس زبان میں لکھ رہا ہوں۔ آخر یہی عوام کی بولی رفتہ رفتہ شائستہ اور ادبی زبان بن گئی اور اب تک اس کا تعلق برابر عوام کی بولی سے رہا۔ میں نے جو بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے جلسے میں یہ کہا تھا کہ اردو میں ہندی زبان کے الفاظ اور محاورے اور امثال جدید ہندی کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں تو یہ محض دھونس بٹھانے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ یہ امر واقعی ہے۔ ادبی زبان بننے پر بھی وہ عوام کی بولی سے جدا نہیں ہوئی برخلاف جدید ہندی کے کہ وہ کتابی زبان ہے انہیں جب کبھی الفاظ کی ضرورت پڑی تو انھوں نے سنسکرت کے ذخیرہ کو ٹٹولا۔ ہمارے پاس پہلے سے ہندی کے لفظ موجود تھے اور بعد میں ہم نے ہندی سے نئے لفظ لینے میں بخل نہیں کیا۔ عوام کی زبان مثل قلب کے ہے جس سے تمام اعضا کو خون پہنچتا رہتا ہے اور ان کی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ جب تک زبان کو عوام کی بولی سے مدد ملتی رہتی ہے وہ زندہ اور چونچال رہتی ہے اور عوام کی بولی کا ساتھ دیتی رہتی ہے اور جس وقت سے اس کا تعلق عوام کی بولی سے منقطع ہو جاتا ہے تو اسی وقت سے اس پر مردنی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یونانی، سنسکرت، لاطینی جو دنیا کی مکمل اور بہترین زبا

خیال کی جاتی ہیں اسی لیے مردہ ہوگئیں۔

البتہ اردو پر ایک ایسا تاریک زمانہ آیا تھا کہ ہمارے شعراء نے اکثر ہندی لفظوں کو متروک قرار دیا اور ان کی بجائے عربی فارسی کے لفظ بھرنے شروع کیے اور یہی نہیں بلکہ عربی فارسی الفاظ جو بہ تغیر ہیئت یا بہ تغیر تلفظ اردو میں داخل ہو گئے تھے انھیں بھی غلط قرار دے کر اصل صورت میں پیش کیا اور اس کا نام "اصلاح زبان" رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تکلف اور تصنع ہمارے ادب پر چھا گئے تھے۔ شاعری ضلع جگت ہوگئی تھی۔ سخن وروں نے لفظوں کو کھیل بنا لیا تھا۔ شاعر کا مقصد کچھ کہنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا کام قافیے کی رعایت سے لفظوں کو جما دینا، اس میں صنائع و بدائع کا رنگ بھر دینا، قافیہ ردیف کھپا دینا اور محاوروں کا نباہ دینا رہ گیا تھا۔ اس میلان کی وجہ سے ہماری زبان ایک ایسی زبان ہوگئی تھی کہ اسے بہت کم انسان بولتے تھے، غرض اس رنگ نے ہمارے ادب کو بے جان، بے لطف اور بے اثر بنا دیا تھا۔

لیکن یہ دور تاریکی چند روزہ تھا۔ اس کے رفع کرنے میں سب سے بڑا کام سید احمد خاں نے کیا۔ ان کی تحریروں نے ہمارے ادب میں نئی جان ڈال دی۔ اگرچہ ان کی زبان اور ان کا انداز بیان سادہ تھا لیکن اس میں فصاحت، اثر اور قوت بھی تھی، انہوں نے علمی اور سنجیدہ مضامین لکھنے کا نیا ڈول ڈالا۔ اور موافق و مخالف دونوں نے ان کی پیروی کی اور ان کے رفقاء یعنی نذیر احمد، شبلی، حالی، اور ذکاء اللہ خاں وغیرہ نے اسے اور چمکایا اور بڑھایا۔ سید احمد خاں کا اردو پر بڑا احسان ہے انہوں نے صرف ہمارے ادب ہی کو نہیں بنایا اور سنوارا بلکہ ہر موقع پر جب ضرورت پڑی اس کی حمایت کی اور اس پر آنچ نہ آنے دی سر سید کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگیا ہے جو "علی گڑھ اسکول" کے نام سے موسوم ہے۔

اس نئے اسکول نے پھر عام بول چال کی طرف رجوع کی خاص کر نذیر احمد حالی، آزاد، ذکاء اللہ نے ان الفاظ کو جو گھروں کے کونوں کھدروں، گلیوں، بازاروں اور کھیتوں میں کس مپرسی کی حالت میں پڑے تھے چن چن کے نکالا، انہیں جھاڑا پونچھا، صاف کیا، جلا دی اور ان میں سے بہت سے اچھوتوں کو مسندِ عزت

پر لابٹھا دیا۔ اس نئے خون نے جو ہمیشہ ہماری زبان کی رگ و پے میں پہنچتا رہا ہے۔ ہمارے ادب کی رونق اور تازگی کو دوبالا کر دیا۔

حضرات! اردو کی مقبولیت کی ایک اور وجہ بھی ہوئی جو قابل غور ہے۔ جس وقت یہ زبان وجود میں آئی تو ملک میں جتنی بولیاں مروج تھیں وہ سب اپنے چھوٹے چھوٹے رقبوں اور حلقوں میں محدود تھیں۔ یہ زبان قدرت سے ایسے ماحول اور ایسے حالات اور اس قسم کے اثرات کے تحت بنی تھی اور اس طرح سے اس کی ترکیب عمل میں آئی تھی کہ وہ خود بخود ملک کے اکثر خطوں میں پھیلتی گئی اور لوگ اسے قبول کرتے چلے گئے ملک میں کوئی دوسری بولی ملک کوئی دوسری بولی یا زبان ایسی نہ تھی جو اس کا مقابلہ کرتی اور جتنی بولیاں یا زبانیں تھیں وہ اپنے حلقے سے باہر نہ بولی جاتی تھیں اور نہ سمجھی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اہل یورپ اور خصوصاً انگریز اس ملک میں آئے تو انہوں نے اسے ہندوستانی یعنی ہندوستان کی زبان سے موسوم کیا اور یہی وجہ ہے کہ جب فارسی کی بجائے اردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار پائی تو کسی نے اختلاف نہ کیا۔ اختلاف ہوتا تو کس بنا پر؟ کوئی دوسری زبان ایسی تھی ہی نہیں جو ہندوستانی ہونے کا دعویٰ کرتی۔

اردو زبان کی ایک خصوصیت اور بھی ہے جس پر بہت کم توجہ کی گئی ہے وہ عورتوں کی زبان ہے۔ یوں تو دنیا میں اور بہت زبانیں ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کی بول چال میں کچھ فرق ہے لیکن اردو زبان میں یہ امتیاز بہت نمایاں اور گہرا ہے اردو نے جس خطے میں جنم لیا یا جہاں جہاں اس نے زیادہ رواج پایا وہاں پردے کی رسم رائج رہی ہے اسی وجہ سے مردوں اور عورتوں کی معاشرت میں بہت فرق پیدا ہو گیا۔ عورتوں کے الفاظ اور محاورے اور ان کا طرز بیان اور بول چال بھی بہت کچھ الگ ہو گئی۔ عورتوں کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔ وہ انسانوں یا چیزوں میں بعض ایسی چھوٹی چھوٹی خوبیاں یا کمزوریاں دیکھ لیتی ہیں جن پر مردوں کی نظر نہیں پڑتی پردے میں رہنے کی وجہ سے ان کا سارا وقت امور خانہ داری، بال بچوں کی پرورش اور نگہداشت، شادی بیاہ، رسم و رواج کی پابندی اور ان کے متعلق جتنے معاملات

ہیں اس میں صرف ہوتا ہے اور اس اقلیم میں ان کی عمل داری کامل ہوتی ہے پھر ان کی زبان اور لہجے میں قدرتی لطافت، نزاکت اور لوچ ہوتا ہے اس لیے انہوں نے اپنے تعلقات کے لحاظ سے جو طرح طرح کے لفظ محاورے اور مثلیں بنائی ہیں وہ بڑی لطیف، نازک، خوب صورت اور سبک ہیں۔ وہ گیت جو عورتوں نے بنائے ہیں جو بہت ہی پر لطف اور دلکش اور نفسیاتی اعتبار سے خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ ایسے الفاظ جن کا زبان سے نکالنا بدتمیزی سمجھا جاتا ہے یا جن کے کہنے میں شرم و حجاب معلوم ہوتا ہے، عورتیں ایسے الفاظ نہیں بولتیں بلکہ وہ اس مفہوم کو لطیف پیرائے میں یا تشبیہ اور استعارے کے ڈھنگ میں بڑی خوب صورتی سے بیان کر جاتی ہیں۔ عربی فارسی کے ثقیل الفاظ جن کا تلفظ آسانی سے ادا نہیں ہوتا وہ انہیں بہت سڈول بنا لیتی ہیں، بعض اوقات ان کے معنی تک بدل جاتے ہیں۔ اور وہ خالص اردو کے لفظ ہو جاتے ہیں۔ ہماری عورتوں کے الفاظ اور محاورے وغیرہ زیادہ تر ہندی ہیں یا عربی فارسی کے لفظ ہیں تو انہیں ایسا تراشا ہے کہ ان میں اردو کی چمک دمک پیدا ہو گئی ہے اب جدید حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ جہاں ہماری اور بہت سی عزیز چیزیں مٹتی جاتی ہیں یہ لطیف زبان بھی مٹتی جاتی ہے۔ ریختی گو شعرا کا بڑا احسان ہے۔ (اگرچہ ان میں سے بعض نے بہت کچھ فحش بھی بکا ہے) کہ انھوں نے اس زبان کو محفوظ کر دیا ہے۔ اس زبان کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ اور محاورے اور مثلیں ادبی زبان میں آ گئی ہیں اور ہمارے ادب کی زیب و زینت ہیں۔ اس زمانے میں نذیر احمد، حالی، سید احمد دہلوی، راشد الخیری اور بعض دیگر اصحاب کی بدولت صنف نازک کی ایک پاکیزہ زبان کا حصہ ہمارا مشترکہ سرمایہ ہو گیا ہے۔ اس کے اضافے سے ہماری زبان میں شگفتگی اور حسن ہی نہیں پیدا ہوا بلکہ اسے مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

"حضرات! آج کل ہر طرف سے یہ آواز سنائی دی جا رہی ہے کہ "سادہ زبان لکھو"۔ گویا سادہ اور سہل لکھنا معمولی بات ہے۔ ایک ادیب کا قول ہے

کہ " ایک اعلیٰ درجے کے باکمال شخص اور ایک احمق میں صرف ایک ہی چیز مشترک ہے اور وہ ہے سادگی"۔

ایسی سادہ زبان لکھنا جس میں سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہو صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ محض سیدھے سادے الفاظ جمع کر دینا اور سپاٹ، بے لطف، بے جان تحریر لکھنا نہ لکھنے سے بدتر ہے۔ ہر شخص کا طرز اور اسلوب بیان جدا ہوتا ہے۔ ادب و شعر میں کوئی کسی کو مجبور نہیں کر سکتا کہ یوں نہیں یوں لکھو۔ حکم سے فرمائش سے کسی کو سادہ لکھنا نہیں آسکتا۔ زبان میں ہر قسم کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے مضمون یا مقتضائے حال کے مطابق جو الفاظ موزوں اور برمحل ہوں استعمال کرے۔ جب ہم کسی بچے یا کسی گنوار سے باتیں کرتے ہیں یا بچوں کے لیے کوئی کتاب لکھتے ہیں تو خود بخود سادہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ سادہ یا مشکل، فصیح یا سلیس لکھنا حالات اور ضرورت پر منحصر ہے اور زیادہ تر لکھنے والے پر اس کا انحصار ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ہماری زبان ہمیں عوام سے، ان پڑھ لوگوں سے گنواروں سے 'پیا یوں' سے پہنچی ہے اور اس کا تعلق کبھی عوام سے منقطع نہیں ہونا چاہیئے۔ بڑا آدمی وہ ہے جس کی آواز سیکڑوں ہزاروں تک پہنچتی ہے اور اس سے بھی بڑا وہ ہے جس کی آواز لاکھوں کروڑوں تک پہنچتی ہے اور دنیا میں سب سے بڑا آدمی وہ ہے جس کی آواز تمام بنی نوع انسان تک پہنچ سکتی ہے۔ جس کا پیام جس قدر سادہ الفاظ میں ہوگا اسی قدر زیادہ انسانوں تک پہنچے گا۔ سید احمد خاں بڑا شخص ہوا ہے کیوں کہ اس کی آواز لاکھوں آدمیوں تک پہنچتی تھی۔ اس لیے کہ اس کی تحریر سادہ، پر اثر، پر خلوص تھی۔ اگر ہم میں اپنے بھائیوں کا درد ہے تو ہماری تقریر اور تحریر ضرور سادہ اور سہل ہوگی۔ لیکن بے چارے ادیب یا مصنف ہی کی گردن دبانا کہ "تو سہل لکھ" ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں دوسرے پہلو کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ آسان اور مشکل اضافی کلمے ہیں۔ ممکن ہے کہ جو چیز مجھے مشکل معلوم ہوتی ہے وہ آپ کے لیے آسان ہو اور جسے

میں آسان سمجھتا ہوں وہ آپ کے لیے مشکل ہو۔ انگریزی کی ایک بہت آسان کتاب لیجیے اور اس کا ترجمہ اردو میں کیجیے۔ اردو میں آ کر یہ آسان کتاب مشکل ہو جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اصل کتاب جس ملک والوں کے لیے لکھی گئی تھی وہاں تعلیم عام ہے۔ پڑھے لکھوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہ الفاظ اور محاورے اور اصطلاحیں جو اس کتاب میں آئی ہیں انھیں وہاں بچہ بچہ جانتا ہے۔ اب جو ہم نے اپنی زبان میں ترجمہ کیا تو پڑھے لکھے بھی اسے نہیں سمجھتے، پڑھے لکھے تو رہے ایک طرف بعض وقت خود مترجم نہیں سمجھتا کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ اس لیے جہاں سادہ لکھنے کی فرمائش اور چیخ پکار ہے وہاں اپنے ملک کی جہالت رفع کرنے اور علم کی روشنی پھیلانے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ پھر خود ناخواندہ طبقہ ذرا اوپر اٹھے گا اور کچھ ہمارے ادیب اور مصنف ذرا نیچے جھکیں گے۔ اس طرح دونوں کے درمیان تفاوت کم رہ جائے گا اور وہ ایک دوسرے کی بات آسانی سے سمجھنے لگیں گے۔

یہ کچھ ایسی مشکل نہیں ہے۔ لیکن ہماری مشکلات اور بھی ہیں اور ان کی طرف اب خاص طور پر توجہ کی جا رہی ہے مگر اب تک ان کے حل کرنے کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ ان میں سے ایک علمی اصطلاحات کا ترجمہ ہے۔ میں اس کے متعلق بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن یہاں نہ اتنا وقت ہے اور نہ مجھے اتنی فرصت ملی کہ تفصیل سے کچھ لکھتا۔ لیکن اتنا ضرور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم نے جو اصطلاحات کو ہوّا بنا رکھا ہے یہ کوئی اچھی بات نہیں قدیم زمانے میں پروہتوں اور مذہبی پیشواؤں نے مذہب کو اور اہل علم نے علم کو پر اسرار بنا رکھا تھا۔ وہ عام آدمی کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور اسی لیے علم ایک خاص طبقے کے قبضہ میں رہتا تھا۔ عام کرنے سے ان کے اقتدار میں فرق آتا تھا۔ اُسے قائم رکھنے کے لیے انھوں نے ایسی اصطلاحات گھڑ لی تھیں جنھیں دیکھتے ہی آدمی مرعوب ہو جائے۔ یہ خیال تو رفتہ رفتہ جاتا رہا لیکن اس کا اثر باقی رہ گیا۔ آپ نے انگریزی میں لاطینی اور یونانی زبانوں سے مشتق اصطلاحیں دیکھی ہوں گی جو کس قدر بے ڈھنگی بے ڈول اور بھیانک ہیں۔ ہمیں اس کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں

تک ممکن ہو ہمیں اصطلاحات کے لیے ایسے الفاظ رکھنے چاہییں کہ ایک معمولی لکھا پڑھا شخص بھی اس کے کسی جزسے واقف ہو اور لفظ اور مفہوم میں جو تعلق ہو اسے تھوڑا بہت پالے۔ اس سے اسے معنی کے سمجھنے میں آسانی ہوگی اور اصطلاحات کے یاد رکھنے میں بھی۔

اسی طرح رسم الخط اور املا کی اصلاح اور سہل بنانے کا مسئلہ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے ٹائپ کے بنانے کا مسئلہ ہے جو ہماری زبان کے لیے موزوں ہو۔ یہ سب مسائل ہماری توجہ کے قابل ہیں ہمیں ایک طرف اپنے ادب کو مستحکم اور علوم و فنون سے مالا مال کرنا ہے۔ دوسری طرف اپنی زبان کی اشاعت منظور ہے۔ اس لیے ان تمام وسائل اور ذرائع پر غور کرنا ہمارا فرض ہے جو ہماری زبان کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے ضروری ہیں۔ ان تمام امور پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں لیکن انجمن ترقی اردو ان سب پر غور کر رہی ہے۔ اور انشاءاللہ جلد ان کو عمل میں لانے کی کوشش کرے گی۔

اگر ہمیں یہ یقین ہے کہ ہماری زبان ایسی زبان ہے جو سارے ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ہو سکتی ہے، اگر ہمیں یہ یقین ہے کہ اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت ہے۔ اگر ہم سچے دل سے سمجھتے ہیں کہ یہ زبان ہماری تہذیب اور ہماری زندگی کا جز ہے تو صاحبو! اگر ہمیں اس کے لیے زیادہ نہیں تو تھوڑا سا تردد، تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنی پڑے تو اس سے گریز نہ کریں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا تو ہو کہ جب کوئی دوسرا اس کے لیے سرگردانی کے واسطے تیار ہو تو اس کا ہاتھ بٹانے میں دریغ نہ کیا جائے۔

انجمن کی چند مطبوعات

اسٹینڈرڈ انگریزی اُردو ڈکشنری بابائے اردو تیسرا ایڈیشن ۲۰۰ روپے

لغت کبیر اردو (اردو سے اردو) جلد اوّل مجلد (الف ممدودہ) مولفہ بابائے اُردو ۵۰ روپے

قاموس الکتب جلد سوم ۵۰ روپے

مخطوطات انجمن ترقی اردو جلد پنجم ۳۰ روپے

ماخذات شعراء و مشاہیر مرتبہ: سیّد سرفراز علی رضوی ۲۵ روپے

سید احمد خاں۔ حالات و افکار (دوسرا ایڈیشن) مرتبہ بابائے اُردو ۶ روپے

اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام مرتبہ: بابائے اُردو ۶ روپے

مرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزم ادب مرتبہ: سیّد حسام الدین راشدی ۲۵ روپے

تذکرہ عقد ثریا مصنّفہ: شیخ غلام ہمدانی مصحفی ۵ روپے

دیوان حسن شوقی مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی ۵ روپے

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ تصنیف: نظامی دکنی، مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی ۵ روپے

تذکرہ مدائح الشعراء مصنف: نواب عنایت حسین مہجور مرتبہ: افسر صدیقی ۵ روپے

طنزیات و مقالات سید محفوظ علی بدایونی مرتبہ: محی الدین بدایونی ۲۰ روپے

جگرؔ حالات و افکار مرتبہ: احمر رفاعی ۲۵ روپے

اقبال از: احمد دین مرتبہ: مشفق خواجہ ۴۰ روپے

تلخیص معلیٰ از: کلب حسین نادر مرتبہ: ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر ۶ روپے

افکارِ عالیہ ترجمہ: ڈاکٹر خان رشید ۱۲ روپے

جاپانی کہانیاں مترجم: شفیع عقیل ۳۰ روپے

اصطلاحات پیشہ وراں حصہ پنجم مرتبہ: مولوی ظفر الرحمٰن دہلوی ۲۵ روپے

تحریک آزادی میں اردو کا حصہ مرتبہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل ۳۵ روپے

مثنوی نل دمن مرتبہ: ڈاکٹر سید عبد اللہ ۱۲ روپے